نوائے ادب

(ششماہی)

جلد ۴۳ : شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۲ع

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

انجمن اسلام

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مشاورتی مجلس

(بمبئی یونیورسٹی کے ضابطہ کے مطابق)

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

•

چیرمین

جناب مصطفیٰ فقیہ

•

سیکرٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

اراکین

پروفیسر عبدالقادر قاضی

جناب عبدالمجید ای پالکا

جناب عبدالستار زری والا

• • • •

مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

•

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ	محترمہ ہمائے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی
•	•	•
معتمد عمومی	شریک معتمدین	خازن اعزازی
جناب عبدالمجید ای پالکا	جناب یوسف مراد	جناب یوسف دلال
	جناب ستار زری والا	

اراکین

جناب کے ضیاءالدین	محترمہ زلیخا مرچنٹ	جناب غازی شیخ
جناب احمد آر پیر محمد	جناب سمیع خطیب	جناب فیض جسدن والا
پروفیسر عبدالقادر قاضی	جناب زین رنگون والا	پروفیسر نظام الدین گوریکر
ڈاکٹر علی محمد یو میمن	ڈاکٹر عبدالکریم نائک	

• • •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (١٩٤٧ سے ١٩٦٨)

پروفیسر سید ظہیرالدین مدنی (١٩٦٩ سے ١٩٧٤)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (١٩٧٥ سے جاری)

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۴۲ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۲ ع

مندرجات

— -

احوال واقعی

مرکزی وزیر صحت کی تشریف آوری ۔

ڈاکٹر مکھن لال فوطہ دار ، مرکزی وزیر صحت ، حکومت ھند (دہلی) نے صدر انجمن اسلام (بمبئی) ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی ایما پر ۴ فروری ۱۹۹۲ع کو تشریف لائے اور انجمن اسلام کے تقریباً تیس اداروں نے گلہائے عقیدت سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر نے ڈائرکٹر کی حیثیت سے گلدستۂ عقیدت پیش کیا۔

اس موقع پر انجمن کے کیمپس (وی ٹی) پر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ جناب سمیع خطیب چیرمن دارالعلوم ٹرسٹ نے استقبال کیا، ڈاکٹر صاحب نے صدارتی تقریر کی اور جناب عبد المجید پالکا صاحب سیکریٹری انجمن اسلام (بمبئی) نے شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر فوطہ دار صاحب نے اپنی تقریر میں انجمن کی کارکردگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ اور مزید فرمایا کہ انجمن اسلام کے زیر اہتمام میڈیکل کالج کی خاطر مرکزی حکومت ھند ہر ممکن مدد دیگی۔

جلسہ قومی ترانہ پر اختتام پذیر ہوا۔

اردو انسٹی ٹیوٹ کی توسیع ۔

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا انسٹی ٹیوٹ کی توسیع کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اور حال میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کو عربی ریسرچ افسر کی حیثیت سے انہوں نے تقرر کیا ہے۔ ڈاکٹر ندوی بمبئی یونیورسٹی کے عربی شعبہ سے سبکدوش ہوئے ہیں لیکن اس سے قبل انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین رہے ہیں

امید ہے کہ ندوی صاحب لائبریری کو باوقار بنانے میں ہر ممکن مدد کرینگے۔

اقلیتی ادارے ۔

مذہبی اور لسانی اداروں کے حقوق کے تعلق سے تاملناڈو کی پانچ رکنی ججوں کی بینچ نے اقلیتی اداروں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ پچاس فیصدی تک مذہبی اور لسانی اقلیتی تعلیمی اداروں میں داخلہ دے سکتے ہیں اور بقیہ پچاس فیصدی اکثریتی قوم کے لئے وقف کردیں اس ضمن میں اقلیتی قوموں کی جانب سے احتجاج کیا گیا اور عیسائی، سکھ، پارسی اور مسلم اقلیتی جماعتوں نے ایک ملا جلا جلسہ بمبئی میں طلب کیا جہاں انجمن اسلام (بمبئی) کی جانب سے ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا نے صدر کی حیثیت سے حصہ لیا اور اپنی تقریر میں کہا کہ اگر اقلیتی ادارے پچاس فیصدی طلبہ کو داخلہ دے سکتے ہیں تو اکثریتی اداروں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ پچاس فیصدی طلبہ دیگر مذہبی اور لسانی اقلیتوں سے لیں اور انکو آگے بڑھنے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کریں۔

اقلیتی اداروں کے منتظمین سے التجا ہے کہ عدالت عالیہ کے اس فیصلہ کے خلاف غور کریں اور ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی تائید میں تجاویز حکومت کے نام ارسال کرکے اقلیتی اداروں کے حقوق کو بحال کریں۔

اردو اکادمیاں :

اردو زبان و ادب کی ترقی و اشاعت اور تحفظ و بقا کی خاطر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اردو اکادمیوں کا انعقاد عمل میں آیا ہے اور یہ سچ ہے کہ اکادمیاں حکومت کے تعاون سے اپنے طور پر حالات کے پیش نظر اردو کی خدمت کررہی ہیں تاہم ان سے جو توقعات محبان اردو کو تھیں وہ پوری نہیں ہورہی ہیں۔

مذاکرے اور مشاعرے کا اہتمام کرنا لازمی ہے لیکن ساتھ ساتھ اردو کے رسائل و جرائد کی بقا کی خاطر ان رسالوں کو لائبریریوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اپنی طرف سے جاری کرانا ازبس ضروری ہے تاکہ اردو کے معیاری رسالے زندہ رہ سکیں اور مالی دشواریوں سے وہ دوچار نہ ہوں۔ اسی طرح مدرسوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں میں اردو کی ابتدائی کلاسوں

کا انتظام کرانا بھی ان کے مقاصد میں سے ہو تاکہ اردو طلبہ کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے طلبہ بھی اس قسم کے مواقع سے استفادہ کرسکیں۔

امید کیجاتی ہے کہ اکادمیوں کے سربراہ اردو حربدوں کی بقا کی خاطر انکی سرپرستی کرینگے اور غیر اردو داں طلبہ کے لئے بالخصوص تعلیمی اداروں میں اردو کلاسوں کا اجرا کرکے اردو کے کار کو تقویت پہنچائینگے۔

شمال مہاراشٹرہ یونیورسٹی کا قیام

امسال حکومت مہاراشٹرہ نے شمال مہاراشٹرہ یونیورسٹی کے نام سے ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کردیا ہے۔ اس کا صدر دفتر جلگاؤں میں ہوگا اور ڈاکٹر این کے ٹھاکرے اس کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہینگے۔ مہاراشٹرہ کی یہ آٹھویں یونیورسٹی ہوگی۔ بمبئی، پونا، ناگپور شیواجی، مراٹھواڑہ، امراوتی، ایس این ڈی ٹی (برائے خواتین) یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی، عربی یا اسلامیات جیسے مضامین نصابات میں شامل ہیں۔ اس نئی یونیورسٹی میں بھی اردو، فارسی اور اسلامیات کے مضامین بھی دیگر مضامین کی طرح شامل نصاب ہیں اور اس بورڈ کے سربراہ پروفیسر اکبر رحمانی ہیں۔ ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں

راہی معصوم رضا کی رحلت

ڈاکٹر راہی معصوم رضا (۱۹۲۸ع - ۱۹۹۲ع) سرطان کے مرض کے سبب سال رواں کے وسط مارچ میں چل بسے۔ وہ ایک اچھے شاعر، ناول نویس اور انشا پرداز تھے اور انہوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر رضا نے تقریباً ۳۰۰ سے زائد فلموں کے لئے مکالمے اور منظر نامے لکھے اور مہابھارت جیسی ٹی وی سیریل کی کہانی اپنے انداز میں قسط بندی میں لکھی۔ ۱۹۶۸ع میں بمبئی آئے اور ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور سیکریٹری حکومت مہاراشٹرہ کے صاحبزادہ حسن غفور صاحب کی تقریب کتخدائی کے موقع پر ان سے ملنے کا مجھے شرف حاصل ہؤا اور گاہے بگاہے بزموں اور تقریبوں میں ملتے رہے ڈاکٹر رضا کی موت سے اردو اور لسانیات کی دنیا میں خلا پڑگیا ہے جس کا پُر ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر

(مدیر)

اقبال کا مرد مومن

از
جناب محمد بدیع الزماں
فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ - ۸۰۱۵۰۵
(دوسری قسط)

(۲) تقـــدیـر

اقبال کے تصورات میں انسان مجبور محض نہیں اور اس کا ہر فعل اور عمل خواہ خیر ہو یا شر، خدا کی مرضی کے مطابق سرزد نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی تقدیر کا ذمہ دار ہی نہیں بلکہ وہ خـــود ہی عذاب اور ثواب کا ضامن بھی ہے کیونکہ وہ جبر سے اختیار کی طرف مائل ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی شخصیت یعنی انسانی خودی کائنات کے ارتقائی عمل کا نصب العین یا اس کی ایک منزل ہے لیکن ایسی منزل جسے خطِ ارتقا کا آخری نقطہ یا سفرِ ارتقا کی آخری منزل کہا جاسکے۔ اس شخصیت یا خودی کے مسلسل اظہار میں صرف فرد ہی کی نہیں بلکہ کائنات کی تقدیر پنہاں ہے اسلئے کہ خارجی کائنات، انسانی وجود سے الگ کوئی مستقل معنویت نہیں رکھتی۔

تقدیر کے متعلق خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

"ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے"
(سورۃ القمر ۵۴ - آیت ۴۹)

ایک موقع پر رسول اللہؐ کو مخاطب فرماکر تاکید کی گئی کہ منکروں اور کافروں کو کہو کہ :

"ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے

ہمارے لئے لکھ دی ہے اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے، اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔» (سورۃ التوبہ ۹ آیت ۵۱)

اب سوال آتا ہے خدا کی مشیت اور انسان کی تقدیر کا - خدا کے نزدیک انسان کے حق میں خدا کی مشیت یہ ہے کہ وہ شکر اور کفر، ہدایت اور ضلالت طاعت اور معصیت میں سے جو راہ بھی اپنے لئے منتخب کرے گا، خدا وہی راہ اس کے لئے کھول دے گا، اور غلط یا صحیح، جو کام بھی انسان کرنا چاہے گا، خدا اپنی عالمگیر مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے، جس حد تک مناسب سمجھے گا اسے اس کام کا اذن اور اسکی توفیق بخش دے گا ایسا اسلئے کہ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لئے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اسکے سامنے پیش کرکے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں کس کا انتخاب کرتا ہے۔ اس نکتہ کو ان آیات سے سمجھا جاسکتا ہے۔

«اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ بُرا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلت عمل کبھی کی ختم کردی گئی ہوتی۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لئے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے انکی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوٹ دے دیتے ہیں انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اسکی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لئے ان کے کرتوت خوشنما بنادئے گئے ہیں۔»
(سورۃ یونس ۱۰ - رکوع ۲)

اب یہاں پر بات تقدیر کے بننے یا بگڑنے کے معاملوں میں عمل کی آجاتی ہے۔ اس لئے اقبال کے نزدیک انسانی شخصیت یا خودی، ایک شئے یا ایک

غیر متحرک منجمد نقطه یا ایک تکمیل کو پہنچا ہوا وجود نہیں ہے بلکه ایک عمل ہے. خودی یا شخصیت، ان کے نزدیک ایک ایسے تناؤ کا نام ہے جو خارجی ماحول سے انسانی نفس پر متواتر حملوں سے پیدا ہوتا ہے. اقبال کے مرد مومن کے تمام فلسفے کی بنیاد عمل ہے. عرفان خداوندی کے بعد عمل ہی سے اسکی شخصیت کا تعین ہوتا ہے.

اس نکته کو که خدا کی مشیت اور اس میں پنہاں انسان کی تقدیر خود اس کے عمل میں مضمر ہے، سورۃ یونس کی مندرجه بالا آیات کے بعد اگلی دو درج ذیل آیات میں فرد اور قوم دونوں کی تقدیر کو ان کے اعمال سے منسوب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے که :

«لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کردیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور انکے رسول انکے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لاکر ہی نه دیا. اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدله دیا کرتے ہیں اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں انکی جگه دی ہے، تا که دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو.»

یہی بات دوسرے موقع پر اس طرح بھی فرمائی گئی ہے که :

«اے انسان، تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے الله کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے» (سورۃ النساء ۴ - آیت ۷۹)

تقدیر کے معاملے میں عمل کے اسی نکته کو جنگ اُحد میں مسلمانوں کی شکست پر اس طرح ذہن نشین کرایا گیا ہے که :

«اور یه تمہارا کیا حال ہے که جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یه کہاں سے آئی؟ حالانکه (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی

مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑچکی ہے ۔ اے نبی ؐ ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون » (سورۃ آل عمران ۳ - رکوع ۱۷)

اسی جنگ کے نتیجہ پر خدا نے اپنی مشیت کے متعلق بھی فرمایا :

« دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو ۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے ۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں ۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا تم میں سچے مومن کون ہیں » (سورۃ آل عمران ۳ - رکوع ۱۴)

مشیت اور تقدیر کے معاملوں میں یہ بھی صاف طور پر فرما دیا گیا ہے کہ :

« آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے ۔ اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو ۔ اللہ بڑا قدر داں ہے اور سب کے حال سے واقف ہے ۔ »

(سورۃ النسآء ۴ - آیت ۱۴۷)

« جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لئے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا ۔ اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے » (سورۃ حم السجدہ ۴۱ - آیت ۴۶)

قرآن میں « شکر » اور « ایمان » کئی مقامات پر ہم معنی اصطلاحات کے طور پر مستعمل ہوئے ہیں چنانچہ مندرجہ بالا آیات سے یہ معلوم ہوا کہ اگر انسان

خدا کا شکر گزار بندہ بنا رہے اور ایمان کی روش پر چلتا رہے اور اپنے عمل اور اپنے ایمان کے خلوص سے شکر گزاری کا ثبوت دیتا رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ اسے مصیبتوں میں ڈالے اور مصیبت آنے پر وہ یہ کہے کہ یہی خدا کی مشیت تھی اور یہی اسکی تقدیر۔ ایسے بے عمل لوگوں کے متعلق اقبال کا کہنا ہے کہ ؎

مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانہ کا گلہ
بندۂ حُر کے لئے نشتر تقدیر ہے نوش
(«ضرب کلیم» - «محراب گل افغاں کے افکار ۱۱»)

صرف وہی شخص زمانہ کا گلہ اور بدقسمتی کا شکوہ کرتا ہے جو پست ہمت اور کم حوصلہ ہوتا ہے مومن کبھی ناکامی سے مایوس نہیں ہوتا۔ اگر اللہ کی مشیت کی بنا پر مرد مومن (جسے اقبال نے مندرجہ بالا شعر میں مرد حر کا نام دیا ہے) کو کسی معاملے میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو وہ اس نشتر (نیش) کو شہد (نوش) سمجھتا ہے اس لئے وہ ہر ناکامی کے بعد دگنی طاقت سے کام لیتا ہے اور انجام کار مشکلات پر قابو پاتا ہے۔ اس شعر میں حوصلہ سے مراد «جذبۂ عشق» ہے جس سے بقول اقبال فرشتے بھی عاری ہیں اس لئے کہ «مقام شوق» یعنی خدا کی محبت میں سرفروشی کے لئے تیار ہوجانا انکے بس میں نہیں۔ اس مقام کو پانے کا حوصلہ صرف مرد مومن ہی کو ہے ؎

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد
(«بال جبریل» - غزل ۴)

اقبال اسی حوصلہ کو مزید تقویت «ارمغان حجاز» کی درج ذیل رباعی میں دیتے ہیں :

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے ؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے ؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے ؟

خـــدا کی مشیت اور انسان کی تقدیر، قرآن کی رو سے، صرف اس پر محصر ہے کہ ایمان و کفر کے معاملوں میں انسان کونسی روش اختیار کرتا ہے کیونکہ اسے دونوں میں کسی کو انتخاب کرنے کی آزادی بخشی گئی ہے۔ انسان نہ پیدائشی جنتی ہے اور نہ پیدائشی جہنمی۔ خدا اس غلط فہمی کو یہ کہکر خود دور کرتا ہے کہ:

"وہی (خدا) ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر تم میں سے
کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔ اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے
جو تم کرتے ہو۔" (سورۃ التغابن ٦٤ - آیت ٢)

اس آیت میں خدا کا یہ فرمانا کہ کسی کے کافر یا مومن بننے میں اس کی مطر راہ راست اسکے عمل پر رہتی ہے اقبال نے خدا کی مشیت اور تقدیر کے معاملے میں یہ کلیہ مرتب کیا ہے کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
("بانگ درا" - "طلوع اسلام")

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خـــدا کی مشیت کسی انسان کی تقدیر کے معاملے میں اس انسان کے "صراط مستقیم" کی ڈگر پکڑکر چلنے یا نہ چلنے پر محصر ہے "صراط مستقیم" پر چلنے والوں کو خدا سیدھا راستہ دکھا کر اپنے فضل و کرم میں لے لیتا ہے۔ ایک موقع پر عام انسانوں کو مخاطب کرکے فرمایا گیا۔

"لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا

سیدھا راستہ (صراط مستقیم) ان کو دکھا دے گا)
(سورۃ النسآء ۴ - رکوع ۲۴)

یہ بات کہ ایک طرف تو صراط مستقیم کی ڈگر پر چل کر ایک مرد مومن خدا کے فضل و کرم میں پناہ لے کر اپنی تقدیر کو خدا کی مشیت بنا دیتا ہے تو دوسری طرف کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کی تقدیر میں پھٹکار لکھ دی جاتا ہے ایک مسلمہ کے طور پر ایک موقع پر اس طرح فرمائی گئی ہے کہ :

« کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت بخشے جنہوں نے نعمت ایمان پالینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آچکی ہیں۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے۔ اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائیگی۔ »
(سورۃ آل عمران ۳ - رکوع ۹)

ایک طرف تو کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کی تقدیر میں پھٹکار ہی پھٹکار ہے تو ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کی تقدیر کے معاملے میں یہ مژدہ سنایا گیا ہے کہ :

« جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے یہ کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہوجاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ »
(سورۃ حم السجدۃ ۴۱ - رکوع ۴)

ان آیات میں فرشتوں کا یہ کہنا کہ « ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے

ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی » اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کرتی ہیں کہ، تقدیر کے معاملے میں، ایمان پر ثابت قدم رہنے اور صراط مستقیم پر چلنے سے عاقبت سنورتی ہو تو سنورتی ہو مگر دنیا اور دنیا کی ساری لذتیں تو سرے سے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ عمل سے صرف جنت یا جہنم ہی نہیں بنتی ہے بلکہ زندگی بھی یہ دنیا بھی بنتی یا بگڑتی ہے۔

جس طرح فرد کی تقدیر کو خدا کی مشیت پر محمول کرنا قرآن کی رو سے غلط ہے اسی طرح قوموں کی تقدیر کو خدا کی مشیت پر محمول کرنا غلط ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ :

> «ہر شخص کے آگے اور پیچھے اسکے مقرر کئے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہوسکتا ہے »
> (سورۃ الرعد ۱۳ - آیت ۱۱)

اقبال نے اسی آیت کی ترجمانی «ضرب کلیم» کی درج ذیل نظم «آج اور کل» میں کی ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اس مضمون کے ذیلی عنوان : «نگاہ» کے تحت قوموں کی تباہی کے وجوہ پر خدائے تعالیٰ کا یہ استدلال گزر چکا ہے کہ ہر قوم اپنی تباہی کی خود ذمہ دار

تھی کیونکہ ان پر جو تباہی آئی وہ نہ تو خــــدا کا ظلم تھا اور نہ خدا کی یہ مشیت ہی تھی بلکہ خود ان کا اپنا ظلم تھا۔ اس لئے کہ خدا نے اپنی کتابوں اور اپنے انبیاء کے ذریعہ سے انسان کو حقیقت کا علم دینے کا انتظام بھی کیا ہے، اور وہ عملی و عقلی وسائل بھی عطا کئے ہیں جن سے کام لےکر وہ ہر وقت انبیاء اور کتب آسمانی کے دئے ہوئے علم کی صحت جانچ سکتا ہے۔ اس رھنمائی اور ان ذرائع سے اگر خدا نے انسان کو محروم رکھا ہوتا اور اس حالت میں انسان کو غلط روی کے نتائج سے دوچار ہونا پڑتا تو بلاشبہ خدا پر ظلم کے الزام کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

خدا کے ان ہی ارشادات کے پیش نظر اقبالؒ کا یہ کہنا ہے کہ قوموں کی بگڑی ہوئی تقدیر کو صرف وہ مرد درویش بنا سکتا ہے جس نے خود کو علائقِ دنیوی سے بے نیاز کرلیا ہو۔ چنانچہ «ضرب کلیم» کی نظم: «محراب گل افغان کے افکار - ۴» کے درج ذیل شعر میں کہتے ہیں:

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی راہ

جبر و اختیار کی باتوں پر حضرت آدمؑ کو ابلیس کے ذریعے سجدہ نہ کئے جانے کے واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ انسان یا جن کا «اختیار» ہی ہے جو اسکی اچھی یا بری تقدیر متعین کرتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

«میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔»
(سورۃ الذّٰریٰت ۵۱ - ۵۶)

خدا نے جن اور انسان دونوں کو یہ آزادی بخش رکھی ہے کہ وہ ایمان یا کفر میں جو راہ انتخاب کرنا چاہیں کریں۔ حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے پر جب خدا نے ابلیس کو راندۂ درگاہ کرتے وقت اس سے پوچھا کہ: «تجھے

کیا ہوا کہ تونے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا ؟» تو اس نے اسے خدا کی مشیت پر محمول کرتے ہوئے کہا :

«میرے رب، جیسا تونے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان
(انسانوں) کے لئے دلفریبیاں پیدا کرکے ان سب کو بہکا دوں گا،
سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تونے ان میں سے خالص کرلیا ہو.»
(سورۃ الحجر ۱۵ - رکوع ۳)

ابلیس کا یہ جواب کہ حضرت آدمؑ کا اسکے ذریعے سجدہ نہ کیا جانا خود خدا کی مشیت تھی اسلئے غلط ہے کیونکہ شیطان فرشتوں میں سے نہیں بلکہ قوم جن سے تعلق رکھتا تھا جنہیں، انسانوں کی طرح کفر و ایمان میں کسی ایک کو انتخاب کرنے کی آزادی دی گئی ہے چنانچہ ابلیس نے کفر کی راہ کو منتخب کیا اور جبر سے اختیار کی طرف آکر اور غلط راستہ اپنا کر اپنی تقدیر کی خرابی کا باعث خود بنا. اختیار کو جبر پر محمول کرنے پر ابلیس کی اسی پستی فطرت پر اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے «تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود»
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود
(«ضرب کلیم» - نظم «تقدیر» بعد از نظم «محمد علی باب»)

اس پستی فطرت کا اطلاق ہر انسان کی تقدیر پر بھی ہوتا ہے جب وہ کفر اور ایمان کے معاملے میں کفر کی راہ اختیار کرکے اپنی تقدیر کو خود بگاڑتا مگر اسے مشیت ایزدی پر محمول کرتا ہے.

ایک مومن اور کافر کی تقدیر اور ان دونوں کے معاملے میں خدا کی مشیت کو مسلمہ طور پر خدا نے اس طرح بھی ارشاد فرمایا ہے :

« پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انساں وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اسکی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات گگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم میں جا گری ؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ انکے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہیگی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اسکے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہوجائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے۔ »

(سورۃ التوبہ ۹ - رکوع ۱۳)

ان آیات کے بعد ہی ایک مرد مومن کی صفات اور ان صفات کی وجہ سے اسکے حق میں خدا کی مشیت کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے۔ ان آیات سے ہمیں « نگاہ مرد مومن » اور اس نگاہ کی وجہ اس کی تقدیر کا بھی بخوبی اندازہ لگتا ہے۔ فرمایا :

« حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے انکے نفس اور انکے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھکر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو ؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اسکی بندگی بجالانے والے، اس کی تعریف کے گن گانے والے، اسکی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اسکے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے، (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے بیع کا یہ معاملہ کرتے ہیں) اور اے نبیؐ ان مومنوں کو خوشخبری

دھ دو ۔ »

یہ ہے تقدیر ایک مرد مومن کی۔ مگر جب وہ نافرمان ہوکر ایمان کی لذت سے محروم ہوجاتا ہے تو وہ تابع تقدیر ہوجاتا ہے لیکن اگر وہ صحیح معنوں میں مومن ہے تو تقدیر الٰہی بن جاتا ہے ۔ یعنی یہ کائنات اسکی مرضی پر چلتی ہے اور آفاق اس میں گم ہوجاتے ہیں ان نکتوں کی ترجمانی اقبال نے انہی قرآنی معنوں میں، اس طرح کی ہے :

کافر ہے مسلماں، تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی
(«بال جبریل» ۔ غزل ۱۲)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
(«ضرب کلیم» ۔ «کافر و مومن»)

یہ بات کہ ہر انسان کی نیک بختی اور اسکے انجام کی بھلائی و برائی کے اسباب و وجوہ خود اسکی اپنی ذات میں موجود ہیں اسے ایک موقع پر اس طرح فرمایا گیا کہ :

«ہر انسان کا شگون ہم نے اسکے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے، اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اسکے لئے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔»

(سورۃ بنیؔ اسرآئیل ۱۷ ۔ رکوع ۲)

مطلب یہ کہ تقدیر کے معاملے میں ہر انسان اپنے اوصاف، اپنی سیرت و کردار اور اپنی قوت تمیز اور قوت فیصلہ و انتخاب کے استعمال سے خود ہی اپنے آپ کو سعادت کا مستحق یا بناتا ہے اور شقاوت کا مستحق بھی اپنی قسمت کے شگون کو نجومیوں کے پاس لئے پھرنا اور ہمیشہ خارجی اسباب کو اپنی بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہی نہیں بلکہ کفر کے مترادف ہے کیونکہ انکا پروانۂ خیر و شر انکے اپنے گلے کا ہار ہے۔ اگر وہ اپنے گریباں میں منہ ڈالے تو دیکھ لیگا کہ جس چیز نے اس کو بگاڑا اور تباہی کے راستے پر ڈالا وہ اسکے اپنے ہی بُرے اوصاف اور برے فیصلے تھے نہ یہ کہ یہی خدا کی مشیت تھی یا یہ کہ کوئی چیز زبردستی باہر سے آکر اس پر مسلط ہوگئی چونکہ قسمت کے شگون کو باہر لئے پھرنا اقبال کے فلسفۂ تقدیر کی ضد ہے اس لئے ایسے لوگوں پر انہوں نے یہ پھبتی کسی ہے کہ:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

(«بال جبریل» - غزل ۴)

سورۂ بنیٓ اسرائیل کے رکوع ۲ کی مندرجہ بالا آیات کے بعد ہی کی آیت میں اسکی وضاحت کی گئی ہے کہ اچھا اور برا شگون صرف راہ راست اختیار کرنے یا نہ کرنے پر منحصر ہے۔ فرمایا گیا:

«جو کوئی راہ راست اختیار کرے اسکی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے، اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔»

ایک مرد مومن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر نہاں ہونے اور آپ ہی تقدیر الٰہی بن جانے کی باتوں کو قرآن کی چند آیات کی روشنی میں سمجھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان جذبۂ عشق کی بدولت خود اپنی تقدیر ہی نہیں بدلتا بلکہ اللہ کے کلمے کو بلند کرکے اور دین اسلام کی اقامت اور حق کی

سربلندی کی خاطر کام کرکے وہ خــــدا کے منصوبے کو ، جو تخلیق کائنات اور تخلیق انسانی میں مضمر ہے ، پورا کرتا ہے اور اسی تکمیل کو اقبال نے ایک مرد مومن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر کو نہاں بتایا ہے ۔ مگر خدا کی یہ تقدیر بھی انسان کے عمل ہی پر منحصر ہے ۔ «ضرب کلیم» کی نظم : «تن بہ تقدیر» میں کہتے ہیں :

«تن بہ تقدیر» ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

ایک مرد مومن کے ارادوں میں خــــدا کی تقدیر نہاں ہونے کی مانوں کو درج ذیل آیات کی روشنی میں گرفت میں لایا جاسکتا ہے :

«اے لوگو جو ایمان لائے ہو ، اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا ۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ، تو انکے لئے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے ۔ لہٰذا اللہ نے انکے اعمال ضائع کردئیے ۔»
(سورۃ محمد ۴۷ - رکوع ۱)

«اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اسکی مدد کریں گے ۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے ، زکوٰۃ دیں گے ، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے ۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔»
(سورۃ الحج ۲۲ - رکوع ٦)

«ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا ، اور انکے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں ۔ اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے

منافع ہیں۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہوجائے کہ کون اسکو دیکھے بغیر اسکی اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔

(سورۃ الحدید ۵۷ ۔ آیت ۲۵)

ان ہی آیات کے پیش نظر اقبال نے "بانگ درا" کی نظم "طلوع اسلام" میں مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ :

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

دین اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اللہ کی مدد کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا۔ اس کے بجائے وہ دلیل و نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت و آزادی رکھنے کے باوجود اسکے لئے حق یہی ہے اور اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ در اصل اللہ کا کام ہے، اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں ان کو اللہ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے۔ اور یہ وہ بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہوسکتی ہے۔ تبلیغ دین اور اقامت دین کی جد و جہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اقبال انہی معنوں میں مومن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر کو نہاں بتاتے ہیں۔

تقدیر کے معاملے میں یہ بات بھی انسانی ذہن کو اکثر الجھن میں ڈالتی رہتی ہے کہ جب ہر چیز کی تقدیر مقرر ہے اور ہر شخص کے گلے میں اسکی تقدیر

کا نوشتہ لٹکا دیا گیا ہے اور جب تقدیر کی برائی اور بھلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت و مصلحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کرچکا ہے وہی کچھ لازماً ہوکر رہنا ہے تو پھر ہمارے دعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے، اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دعا مانگے بھی تو اسکی دعا میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔ اس غلط فہمی کو خدا نے اس طرح رفع کیا ہے:

> "تمہارا رب کہتا ہے: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کرونگا جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے"

(سورۃ المؤمن ۴۰ - آیت ۶۰)

اس آیت میں خدا کے یہ فرمانے سے کہ: "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا" یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ قضا اور قدر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح معاذ اللہ، خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دئے ہوں اور دعا قبول کرنے کے اختیارات اس سے سلب ہوگئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے، مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دعائیں یا التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔ دوسری بات جو اس آیت سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرکے اور اس سے دعا مانگ کر اسکی آقائی و بالادستی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اظہار عبودیت بجائے خود عبادت بلکہ جان عبادت ہے جسکے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہ رہے گا قطع نظر اس سے کہ وہ خاص چیز اس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لئے اس نے دعا کی تھی۔ قضا اور قدر کے معاملے میں دعا کے ان ہی نکتوں کو اقبال نے "ضرب کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے تیسرے بند میں رقم کیا ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
وہی شراب وہی ہائے و ہو رہے باقی
طریقِ ساقی و رسمِ کدو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

«نگاہ» ، «مرد مومن» اور «تقدیر» کی اصطلاحات کو قرآن کی روشنی میں سمجھ لینے کے بعد ہمارے لئے اقبال کے اس مصرع : نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں» کو گرفت میں لانا آسان ہوجاتا ہے کیونکہ یہ مصرع نہ تو اقبال کی کوئی شاعرانہ اختراع ہے اور نہ کوئی ابہام بلکہ اس کلیہ کا سارا مواد اقبال نے قرآن ہی سے فراہم کیا ہے جس کی اب ایک مجموعی تفہیم پیش کی جارہی ہے ۔

اقبال کے مرد مومن کے تمام فلسفے کی بنیاد عمل ہے اور مرد مومن ایمان اور عمل کا متوازن مرکب ہے ۔ اس کی قوت ، ہمت ، حوصلہ، شجاعت، عزم، استقلال ، ثبات ، جوش ، ولولہ اور بلند ہمتی سب کے سب اس سے عمل کے متقاضی ہیں اسلئے کہ عمل ہی سے افراد بنتے ہیں اور قومیں سنورتی ہیں ۔ اقبال کے مطابق شخصیت کے استحکام کا انحصار عمل پر ہے ۔ خودی کی بلندی اور انفرادیت کی تکمیل عمل کے بغیر ناممکن ہے ۔ بقول اقبال :

> «انسان کی زندگی کا مقصدِ اولیٰ عمل ہے ۔ قرآن کریم میں جہاں یہ ارشاد ہے کہ جن اور انسان کی تخلیق کا مقصد خدا کی عبادت کرنا ہے وہاں عبادت کا مطلب عمل ہے ۔»

عمل اور تقدیر کے باہمی تعلق پر اقبال نے «بال جبریل» کی نظم «روح

ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے» کے درج ذیل دو بندوں میں اس طرح روشنی ڈالی ہے :

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

سالنده تیرے خود کا پور نار ازل سے تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

مرد مومن کی نگاہ تقدیریں اس لئے بدلتی ہے چونکہ اس نے اپنی خودی کی تزئین و ترتیب کرکے وہ نگاہ پیدا کی ہے جو دیکھنے کے لئے مہر و ماہ کی محتاج نہیں اسی لئے اقبال نے نگاہ کی دو قسمیں بتائی ہیں :

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاج مہر و ماہ نہیں
(«ضرب کلیم» - «محراب گل افغان کے افکار - ۱۹»)

یعنی ایک نگاہ تو وہ ہے جس کی مدد سے ہم مختلف رنگوں میں امتیاز کرتے ہیں اور مادی ترقی اسی نگاہ پر موقوف ہے۔ مگر چونکہ انسان صرف مادی نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر ایک حقیقت روحانی بھی ہے اسلئے حقیقی نگاہ وہی ہے جو مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔ اسلئے ایک مرد مومن دل کی نگاہ پیدا کرتا ہے جو فقر کی بدولت پیدا ہوتی ہے اور وہ اسی نگاہ کا پیرو ہے۔

مشیت اور تقدیر کے معاملے میں یہ سمجھ لینا کہ آخر انسان اپنی تقدیر کیوں کر بدل سکتا ہے صرف قرآنی تعلیمات سے آگاہی نہ ہونے کی وجہکر ہی پیدا ہوتی ہے جب ایک مرد مومن اپنی مرضی کو یعنی اپنے آپ کو رضائے حق میں فنا کردیتا ہے تو اس کی اطاعت سے خدا اس قدر خوش ہوتا ہے کہ اسے

مقربین بارگاہ میں داخل کرلیتا ہے اور اس طرح بندۂ مومن خود «ارادۂ الٰہی» بن جاتا ہے ۔ یعنی وہ جو کہتا ہے وہی ہوجاتا ہے ۔ اقبال نے «اسرار خودی» میں اس سوال کا جواب کہ انسان خود اپنی تقدیر کس طرح بدل سکتا ہے یہ دیا ہے کہ :

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

اقبال کا کہنا ہے کہ اگر انسان اللہ کے احکام کی نہایت تندہی کے ساتھ اطاعت کرے تو گرچہ بلحاظِ اصل خویش وہ مجبور ہے لیکن اس کے اندر اختیار کا رنگ پیدا ہوجائے گا مگر شرط یہ ہے کہ مسلمان مجسم تسلیم و رضا بن جائے یعنی اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کردے ۔ اسلئے اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ :

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

ان ہی ساری باتوں سے ایک مرد مومن میں تقدیر شکن قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ تقدیر کا زندانی نہیں رہتا :

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
(«بال جبریل» - غزل ۱۵)

یہ غلط فہمی بھی کہ خدا نے انسان کو مجبور محض بنا کر دنیا میں بھیجا ہے ایک ایسی غلط فہمی ہے جو صرف قرآن کی روح اور اطاعت کے معنی کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ انسان کی تقدیر صرف اطاعت سے بنتی ہے اور اسکی اولیں شرط خدا نے اطاعت رسولؐ کی رکھی ہے ۔ خدا نے خود اپنی اطاعت کا رخ رسولؐ کی اطاعت پر یہ کہہ کر پھیر دیا ہے کہ :

"اے نبیؐ لوگوں سے کہدو کہ : "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے در گزر فرمائے گا. وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے" — ان سے کہوکہ . "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو" - پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں "
(سورۃ آل عمران ۳ - رکوع ۴)

اقبال نے ایسی ہی آیات سے یہ کلیہ مرتب کیا ہے کہ :

"رسول اقدسؐ کی اس دنیا میں تشریف آوری کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ عمل خیر ہے اور فقدان عمل شر ہے. کامیابی اور ناکامی کا خیال کئے بغیر جد و جہد جاری رکھو."

اقبال نے قضا و قدر کے معاملے میں متذکرہ بالا آیات سے اطاعت رسول کو مرکزی نقطہ قرار دیتے ہوئے ایک مرد مومن کی تقدیر کا یہ پہلو نکالا ہے کہ :

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
("بانگ درا" - "جواب شکوہ")

تو یہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایک انسان رسولؐ کی اطاعت میں گرویدگی کا اظہار کریگا تو کوئی وجہ نہیں کہ خـــدا ایک "صراط مستقیم" پر چلنے والے کی رضا کو خـــود اپنی رضا نہ سمجھے اور کامیابی اس کا قدم نہ چومے . اس نکتہ کو کہ اس اطاعت سے ایک مـرد مومن خود اپنی تقدیر بدلتا ہے اقبـال نے "ضرب کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے سترھویں بند کے درج ذیل شعر میں اس طرح ذہن نشین کرایا ہے :

تو اپنی سر نوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

یہ کہ یہ اطاعت ہی خدا کی مشیت اور انسان کی تقدیر بدلنے کی ضامن ہے اسے ان آیات کی روشنی میں بھی سمجھا جاسکتا ہے :

« کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اسکے دل کو ہدایت بخشتا ہے، اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں لہذا ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔»
(سورۃ التغابن ٦٤ - رکوع ۲)

اقبال کے نزدیک تو تقدیر کے پابند فقط نباتات و جمادات ہیں جبکہ ایک مومن فقط احکام الہی کا پابند ہے۔ اسلئے بھی کہ جمادات اور نباتات کی زندگی کی جو تقدیر اللہ نے متعین فرمادی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر مسلمان احکام الہی کی پابندی کرے تو خدا اسے اپنے فضل و کرم کی پناہ میں لے لیتا ہے اور اس طرح اسکی تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ «ضرب کلیم» کی نظم : «احکام الہی» میں اقبال کہتے ہیں کہ :

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام ؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خرد مند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اسکا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الہی کا ہے پابند

اقبال کے نزدیک روح انسانی خود اپنی تقدیر کی معمار ہوسکتی ہے۔ اقبال نے مومن کو اس لئے تقدیر الٰہی کہا ہے چونکہ شریعت محمدی اس کا مزاج بن جاتی ہے جس سے اسکے لئے جبر سے اختیار کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ مومن احکام الٰہی کو اپنا مقدر سمجھتا ہے اور مشیت کو اپنے وعدوں کا بہرحال بھرپور پاس رہتا ہے اسلئے جہاں خدا کی مرضی اور مرد مومن کے عمل میں اتصال پیدا ہوتا ہے وہاں تقدیر کے قیود ختم ہوجاتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ تقدیر قوموں کے عمل پر بھی ہر لحظہ نظر رکھتی ہے اور اسکی نظر اتنی تیز ہے جیسی تلوار کی دھار۔ تاریخ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو قومیں فطرت کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں وہ اپنی تقدیر بدلتی رہتی ہیں اور جو نافرمانی کرتی ہیں خدا انہیں مٹا دیتا ہے اقبال نے «ضرب کلیم» کی نظم : «تقدیر» (بعد از «ملائے حرم») میں اسی کلیہ کو پیش کیا ہے :

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اسکی
بُرّاں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

اقبال ایک نئے آدم کی تعمیر ممکن سمجھتے ہیں جو اپنے لئے نیا جہان اور نئی تقدیر پیدا کرے وہ جب یہ کہتے ہیں کہ اگر تو بدل جائے تو یہ عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بھی بدل جائے تو وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کے لامتناہی ارتقا کا کوئی پہلے سے بنا بنایا نقشہ کسی لوح پر محفوظ نہیں ہے۔

زندگی جیسے جیسے تخلیقی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے وہ اپنی تقدیر خود ڈھالتی جاتی ہے۔ اقبال تقدیر کے مسئلے کو یوں بھی حل کرتے ہیں :

اے کہ گوئی بودنی این بود شد ۔ کار ہا پابند آئین بود شد
معنی تقدیر کم فہمیدۂ ۔ نے خودی را نے خدا را دیدۂ
مرد مومن با خدا دارد نیاز ۔ «با تو ما سازیم تو با ما بساز»
عزم او خلاق تقدیر حق است ۔ روز ہیجا تیرا و تیر حق است

جبر کے ثبوت میں سب سے قوی استدلال جو پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اگر ہمارے افعال کا فاعل نہیں تو مجبور ہے اور اگر قادر ہے تو ایک فعل کے دو فاعل نہیں ہوسکتے۔ اقبال کا جواب، ان ساری باتوں سے جن کا ذکر ابھی تک کیا گیا، یہ ہے کہ جو چیز جس چیز کے ذاتیات میں ہے وہ اس سے کسی حالت میں منفک نہیں ہوسکتی۔ چونکہ قوت اختیاری بھی انسان کی ذاتیات میں سے ہے اس بنا پر وہ کسی حالت میں سلب نہیں ہوسکتی۔ ہم سے جب کوئی فعل سرزد ہوتا ہے تو گو خدا ہمارے فعل پر قادر ہے مگر اس کی قدرت اور اختیار بھی ہمارے قوت اختیار کو جو ہماری ذاتیات میں ہے سلب نہیں کرتا۔

اقبال کو جس انسان کی تلاش ہے وہ اپنی تقدیر کا خالق آپ ہے اور ان کے یہ تصورات سراسر قرآنی ہیں۔ ان کے نزدیک جس کو تقدیر کہتے ہیں وہ حقیقت میں قوانینِ حیات کا نام ہے لیکن قانون قانون نہیں ہوسکتا جب تک وہ تبدیلی اور تلون سے مبرا نہ ہو۔ تقدیر کا اٹل ہونا صحیح ضرور ہے مگر چونکہ عمل اختیار سے سرزد ہوتا ہے اس لئے اس کے نتائج تقدیری یعنی آئینی ہیں۔ دراصل صداقت جبر و اختیار کے بَین بین ہے۔ انسان ان معنوں میں مجبور ہے کہ خالق کائنات اس کے ارادوں اور عزائم کا بھی خالق ہے لیکن عملی زندگی میں ہر آدمی اپنے طور پر مختار ہے۔ اس کے اعمال و افعال خود اسی کے ارادوں کے مظہر ہیں۔ امرونہی اور اطاعت و فرمانبرداری کے احکام شرعی کی اسی لئے حاجت ہوتی ہے۔

اقبال کے نزدیک انسان جسم و روح کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ وہ جہد پیہم سے کائنات کو تسخیر کرکے اوامر و نواہی کے نفاذ کے ذریعے نیابتِ الٰہی کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ زیرکی کو عشق کے تابع رکھتا ہے کیونکہ عشق ہی کے دام میں یہ خدائی گرفتار ہوسکتی ہے اور عشق ہی کے ذریعے اس میں الٰہیہ صفات پیدا ہوتی ہیں جس سے وہ اپنا دائرہ تسخیر بڑھاتا ہے اور اس بات پر بھروسہ رکھتا ہے کہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور تقدیر اسی جہد مسلسل کی تابع ہے غرض ہر انسان اپنی تقدیر کا خود ذمہ دار ہے۔ اقبال کا مرد مومن تقدیر کے عام مفہوم سے گریزاں ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک تقدیر تدبیر کی محتاج ہے۔ تدبیر کے لازمی نتائج کے طور پر تقدیر بنتی یا بگڑتی ہے۔

اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ : «نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں» تو انکے پیش نظر وہ انسان کامل ہے جو ایمان کے افضل ترین مقام پر فائز ہے صاحب علم و عمل ہے۔ وارث ذکر و فکر ہے۔ اس کی بصیرت کی بنا رسول پاکؐ کا اسوۂ حسنہ ہے اور اسکی فراست کی بنیاد رسول پاکؐ کے اعمال و افکار و احادیث پر استوار ہے۔ یہ وہ انسان کامل ہے جس نے خود کو مشیتِ ایزدی میں گم کردیا ہے اور مشیت ایزدی اس میں جذب ہوگئی ہے الغرض تقدیر، اقبال کے فلسفہ میں، وہ انسان اپنے جذبۂ عشق سے بدلتا ہے جو مجسم قرآن بن چکا ہے اور یہی ہے اسکی وہ شبیہہ جو اقبال نے پیش کی ہے :

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(«ضرب کلیم» - «مرد مسلمان»)

● ● ●

دکنی ادب میں ثقافتی عنصر کی چھان بین

از

ڈاکٹر نور السعید اختر

شعبۂ فارسی، مہاراشٹرہ کالج، بمبئی (۸)

اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے قبل عربوں کے جہازی بیڑے ہندوستان کے جنوبی ساحلوں پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ ان کا ہندوستانیوں سے مختلف سطحوں پر ربط و ضبط تھا۔ ہندوستانی بازاروں میں عربی سوداگروں کے ڈول کے غول گرم مسالوں (مصالحوں - عربی) کے عوض ہندوستانی شمشیریں اور پارچہ جات خریدتے تھے۔ ہندوستان میں باضابطہ طور پر ۹۲ھ / ۷۱۲ع میں مسلمانوں کی اولین حکومت شمالی ہند میں قائم ہوئی سندھ کی فتح کے بعد اسلامی پرچم صدیوں تک ہندوستان میں لہراتا رہا۔ اس دوراں حاکموں کی روادری اور انسانی دوستی نے ہندالمانی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا۔ بادشاہوں کے اس غیر جانبدارانہ رویہ نے عوام کو تبادلہ خیالات کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع فراہم کئے۔ ہندو، مسلم معاشرے کے اس گنگا جمنی امتزاج نے ایک دوسرے کے تمدن پر گہرا اثر ڈالا۔

چھٹی صدی ہجری (۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ع) میں مسلمانوں نے دہلی کی چوہان حکومت کو ختم کردیا اور مسلماں فاتحین کے قدم مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے فاتحین شمال کی جانب سے دریائے سندھ کو پار کرکے آگے بڑھے تو پنجاب ان کی زد میں آیا۔ پھر انھوں نے دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔ ترکوں مغلوں اور افغانوں پر مشتمل مسلمانوں کے خاندان کے خاندان، پنجاب اور دہلی کے نواح میں رس بس گئے۔ بول چال اور سرکاری زبان کے طور پر انھوں نے فارسی زبان کو ترجیح دی۔ ملکی زبانوں پر غیر ملکی زبانوں کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ زبانوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن میں بھی دو قلمونی نظر آنے لگی یہی عمل دونوں اقوام کی بود و باش اور خورد و نوش کے طور طریقوں پر اثر انداز ہوا۔

دہلی کی فتح کے بعد مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا۔ ابتدا میں صوفیاء کرام نے علم و نور کی شعاؤں سے جہالت کی تاریکی دور کی۔ اس کے بعد علاوالدین خلجی اور پھر ملک کافور نے دکن پر پے درپے حملے کئے۔ ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ ع میں اسلامی پرچم راس کماری کے کناروں تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد سیاسی، سماجی اور ثقافتی طور پر طوفانی سیلاب محمد بن تغلق ۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ۔ مطابق ۱۳۲۵ ع تا ۱۳۵۱ ع کے عہد میں اُٹھا اور دکن میں جاکر تھما محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دیوگڑی کو دولت آباد سے موسوم کرکے پایہ تخت کا درجہ عطا کیا۔ نہ صرف فوجی دستے اور اسلحے بلکہ تمام فنون کے ماہر و شائق دولت آباد (دکن) پہنچے۔ اہل علم کے ساتھ اہل حرفہ بھی دکن میں کشاں کشاں وارد ہوئے۔ فنی دستگاہ رکھنے والے ہنر مندوں نے دکن کو دائمی طور پر اپنالیا۔ دکن کی خاموش اور پرکیف فضاؤں میں گویا دھنک بکھر گئی۔

سلطان محمد تغلق کے عہد میں دکنی صوبہ داروں اور امیروں نے بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت کی باغیوں کو دو سال کی ریشہ دوانیوں کے بعد کامیابی نصیب ہوئی۔ شاہی لشکر کی پسپائی کے فوراً بعد حسن خان المخاطب بہ ظفر خان علاؤ الدین بہمن شاہ کے خطاب کے ساتھ دکن کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ بہمنیوں کی حکومت تقریباً ۲۰۰ سو سال تک قائم رہی۔ جب اس شاندار حکومت کی بنیادیں کمزور ہوئیں تو دکنی صوبہ داروں نے اپنے اپنے صوبوں سے خود مختاری کا اعلان کردیا یہ عظیم الشان سلطنت پانچ خود مختار ریاستوں (بیجاپور۔ گولکنڈہ۔ احمد نگر۔ برار۔ بیدر) میں تقسیم ہوگئی۔

۹۳۳ھ/۱۵۲۶ ع میں ظہیر الدین بابر نے دہلی کی لودھی سلطنت کو ختم کرکے عہد مغلیہ کے زریں دور کی بنیاد رکھی۔ بابر کے ہمراہ ازبکی ترک و ایرانی سپاہی ہندوستان پہنچے۔ شاہی دربار میں فارسی زبان کی پذیرائی بڑھ گئی۔ ایرانیوں کی قدر و منزلت میں اضافہ ہونے لگا ایرانی فنکاروں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے ۱۵۳۰ ع میں بمشکل چار سال کی بادشاہت کے بعد بابر کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد بابر کا وارث ہمایوں جانشین ہوا۔ ہمایوں کو شیر شاہ سوری نے ہندوستان

بدر ہونے پر مجبور کیا۔ کم و بیش ۱۴-۱۵ برسوں تک شیر شاہ اور اس کے جانشینوں کی حکومت قائم رہی۔ ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے دہلی پر دوبارہ قبضہ جمایا۔ اس مرتبہ اس کے رکاب میں ایرانیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چونکہ کھوئی ہوئی حکومت کے حصول میں ایرانیوں کا معتدبہ حصہ تھا اس لیے اعلیٰ ترین عہدوں پر ایرانی فائض ہوئے۔

افغانوں، ترکوں اور ایرانیوں کی متواتر آمد و رفت نے ہندوستانی ماحول اور معاشرے میں تبدیلیاں پیدا کیں پیدائشی ماحول اور ذائقوں کے مطابق مطبخوں اور عوام کے دسترخوانوں پر گنگا جمنی تہذیب کے اثرات نمایاں نظر آنے لگے۔ مسلمان بادشاہوں کی شکار سے دلچسپی نے نت نئے گل کھلائے اکبر اعظم نے مطبخوں اور اس کے انتظام کے لئے خصوصی شعبے مقرر کئے۔ مرغ و ماہی، آبی پرندوں کے علاوہ تیتر و دراج اور تنذور کے الوان نعمت عوام اور خواص کے دسترخوانوں کی زینت بنے۔ ادھر شاہی باورچی، رکاب دار، چاشنی گیر اور داروغہ مطبخ، نعمت خان کے القاب سے سرفراز ہوئے۔ اس فن میں یدطولیٰ رکھنے والے ماہرین، کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ انکا اعلیٰ عہدوں پر تقرر عمل میں آیا۔

شیر برنج، دمپخت، چلوکباب اور آش کے عاشق بابر کو ہندوستانی کھانوں سے رغبت ہوئی۔ اس نے ابراہیم لودھی کے شاہی طباخ کو خرگوش کا گوشت پکانے کی فرمائش کی۔ طباخ نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاکر اپنے آقا کی شکست کا بدلہ لینا چاہا۔ غرض کہ بابر کو خرگوش کے سالن میں اس باورچی نے زہر دے دیا بالآخر یہی زہر بابر کی موت کا باعث ہوا۔ بابر نے اپنی خود نوشتہ سوانحیات میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اس سانحہ کے بعد مغلیہ درباروں میں چاشنی گیروں (شاہی کھانا چکھنے والے) کا تقرر عمل میں آیا۔ عہد قدیم میں ایسے ظروف ایجاد ہوچکے تھے جن میں اگر زہریلا کھانا ڈالا جاتا تو ان کا رنگ بدل جاتا تھا۔ کچھ جانوروں اور پرندوں کو بھی سدھایا جاتا تھا جو زہریلا کھانا دیکھ کر یا بو پاکر خبردار کر دیتے تھے۔ ہمایوں کو عیش و عشرت کے لئے زیادہ مہلت نصیب نہ ہوئی البتہ شہنشاہ اکبر نے شاہی مطبخوں کے شعبوں کی جانب

خصوصی توجہ دی۔ وہ خود بھی انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کا شوقین تھا۔ اکبراعظم کی ہندو رانیوں کے لئے ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق رسوئی تیار ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ مغلوں کے یہاں آخر تک چلتا رہا۔ جہانگیر شباب، شراب اور کباب کا حد درجہ رسیا تھا۔ اسے شکار سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی تھی۔ تزک جہانگیری کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نے کم و بیش ۵۵،۰۰۰ چرندے، پرندے اور خونخوار جانور شکار کئے تھے۔ اسے آبی پرندوں اور مچھلیوں کے گوشت سے بے پناہ رغبت تھی وہ شاہی مطبخ کی نگرانی خود بھی کرتا اور اپنی چہیتی بیگم نورجہاں سے بھی کرواتا نورجہاں مطبخ داری کے فن میں مہارت رکھتی تھی لہذا وہ اسی خصوصیت کی وجہ سے بھی جہانگیر کی تا دم آخر منظور نظر بنی رہی شاہجہاں کا دور امن و امان سے ہمکنار تھا۔ اُسے بھی انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں سے دلچسپی تھی حتیٰ کہ وہ تلوار سے روہو مچھلی کی کھال ثابت و سالم اُتار سکتا تھا اس کا ذکر تزک جہانگیری میں خود جہانگیر نے کیا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہجہاں کو اس فن میں کس پایا کا درک ہوگا۔ عہد شاہجہانی کے الوان نعمت کی تفصیل کو "نسخہ شاہجہانی" میں دیکھ کر اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے حسمیں، نان آش، قلیہ، دو پیازہ، بھرتھا، زیر بریاں پلاؤ، یخنی، کباب، ہریسہ، شش رنگ، خاگینہ، پوری، شیرینی، کھچڑی، مربے اچار، حلوؤں اور دیگر پکوانوں کا ذکر موجود ہے۔

نسخۂ شاہجہانی[1] کے مرتب مولوی سید فضل اللہ رقمطراز ہیں کہ شاہجہان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا جس پر مختلف قسم کے الوان نعمت چنے جاتے تھے۔ اس کے عہد حکومت میں جس طرح دوسرے شعبوں کو فروغ ہوا اس طرح شعبۂ مطبخ میں بھی اعلیٰ درجہ کی ترقی ہوئی جس کا اندازہ نسخۂ شاہجہانی کے مطالعہ سے ہوتا ہے . . . نسخۂ شاہجہانی کی ابتدائی عبارت "دستور پختن اطعمۂ در سرکار شاہ جہان بادشاہ مع وزن بعمل می آمدہ" سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب

---

۱ نسخۂ شاہجہانی مرتبہ سید محمد فضل اللہ، گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری مدراس (۱۹۵۶ ع)، مقدمہ (ص ۲ تا ۳)

ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جو شاہجہاں کے شاہی دسترخوان کے انواع و اقسام کے کھانوں سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کتاب میں پلاؤ کی ۵٦ اور قلیہ کی ۳٦ قسمیں بیان کی گئی ہیں......... اگر سچ پوچھئے تو مغل شہنشاہوں نے اس آرٹ کو جتنی ترقی دی۔ ان سے قبل کسی نے نہیں دی۔ شاہان مغلیہ کے بعد باورچی خانوں اور دسترخوان کے متعلق دربار لکھنو نے جو رنگ دکھائے اور جدت طرازیاں کیں وہ بھی قابل ستائش ہیں۔ حیدرآباد میں نواب سالار جنگ کا باورچی کا کمال یہ تھا وہ کسی ایک چیز کو مختلف صورتوں میں دکھا کے ایسا بناتا کہ دسترخوان پر بیسیوں قسم کے الوان نعمت نظر آتے مگر چکھنے میں وہ یکساں ہوتے۔ بعض رکابدار کریلے ایسی نفاست سے پکاتے تھے کہ دیکھئے تو معلوم ہوتا تھا کہ انہیں بھانپ بھی نہیں لگی ہے، ویسے ہی ہرے اور کچے ہیں مگر کھائیں تو نہایت پرلطف اور لذیذ ہوتے تھے۔

غرض امیروں اور شہنشاہوں کا ذوق دیکھ کر باورچیوں نے بھی حدت طرازیاں شروع کردیں۔ کسی نے پلاؤ انار دانہ ایجاد کیا، جس میں ہر چاول آدھا یاقوت کی طرح سرخ اور جلادار ہوتا اور آدھا سفید مگر اس میں بھی شیشے کی طرح چمک موجود ہوتی۔ کسی نے نورتن پلاؤ ایجاد کیا جس میں نو رنگ کے چاول ملائے جاتے۔ کچھ پلاؤ مرغ کو مشک اور زعفران کھلاکر تیار کئے جاتے،... پلاؤ کی ایک اور قسم موتی پلاؤ بھی ہے اس کی شان یہ تھی کہ چاولوں میں گویا آبدار موتی ملے ہوئے ہیں[۱]۔

بادشاہوں، امیروں، وزیروں اور عوام الناس کے متمول خاندانوں میں جہاں آسودگی میسر تھی، زر و مال کی افراط تھی، رکاب داری کے فن نے روز افزوں ترقی کی۔ کہیں پر مرغن پکوان، کہیں پر برشتہ، کہیں پر خشکہ سے لے کر بریانی تک اور کہیں پر کوکو کباب، شامی کباب، نرگسی کباب کی روح پرور خوشبوؤں سے باورچی خانے مہک اٹھے۔ رکاب داروں نے اپنے اپنے فن کے کمالات مبالغہ کی حد تک کر دکھائے۔ مثال کے طور پر:-

۱ نسخۂ شاہجہانی (ص ۴ - ۵)

«میر بیر علی رکابدار کے متعلق مشہور ہے کہ وہ انار بناتا تھا. اوپر کا چھلکا اور اندر کے دانوں کی ترتیب اور ان کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے تھے. دانوں کی گٹھلیاں بادام کی طرح ہوتی تھیں. ناشپاتی کے عرق کے دانے ہوتے تھے، دانوں کے بیچ کے پردے اور اوپر کا چھلکا دونوں شکر کے ہوتے تھے[1].»

اس فنکاری کے نتیجہ میں رولیوں کی بیسیوں قسمیں وجود میں آئیں. تندور نے سونے پر سہاگے کا کام کیا. فنی لیاقت کے جوہر مبالغہ کی حد تک پہنچ گئے. حتیٰ کہ مونگ کی دال کی معمولی کھچڑی کا طباخ اتنا مشہور ہوا کہ ایک نواب صاحب نے اسے اپنا باورچی مقرر کیا. اس باورچی کی ایک شرط تھی کہ اس کھچڑی کے گرم گرم لقمے تازہ دم دیگ (دیغ) ہی سے کھائے جائیں. کسی دن نواب موصوف نے کھچڑی پکانے کی خواہش کی لیکن وہ رکاب دار کی شرط بجا نہ لاسکے باورچی نے غصہ میں وہ کھچڑی ایک سوکھے درخت کے تنہ پر پھینک دی اور چلا گیا. سوکھا ہوا پیڑ مرغن، معطر اور مقوی اشیاء سے نمو پاکر سرسبز و شاداب ہوگیا نواب صاحب رکاب دار کے فن کے قائل ہوگئے.

اگرچہ یہ باتیں بے پر کی معلوم ہوتی ہیں. تب بھی ان میں ایک حقیقت مضمر ہے بہر کیف بادشاہوں کی سرپرستی میں یہ فن پروان چڑھا. درباروں میں رکابداروں کی پذیرائی ہوئی. شادی بیاہ کے موقعوں پر رکابداروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا. لذیذ اور چٹخارے دار الوان نعمت، مٹھائیوں کی دوکانوں اور چاٹ کی اقسام نے لوگوں کو موہ لیا بازاروں کے گلی کوچے، مختلف النوع لذت دار کھانوں سے اٹ گئے اور ہندوستان کا ہر خطہ اپنی جغرافیائی خصوصیات کی وجہ سے الگ الگ پکوانوں کے لئے مشہور ہوگیا مثلاً دہلی کا حبشی حلوہ یا حلوۂ سوہن، لکھنو کی امرتی، حیدرآباد کی قلاقند یا اشرفی، بمبئی کا، بمبئی حلوہ، آگرے کا پیٹھا گجرات کی گھاری وغیرہ وغیرہ.

دکن میں بھی اور خطوں کی طرح یہ فن پروان چڑھا. دکنی بادشاہوں نے رکابداروں کو بساط بھر نوازا دکنی شعراء نے تہذیب و ثقافت کے مختلف گوشوں

---

۱ نسخۂ شاہجہانی (ص ۵)

کچھ ساتھ اس فن پر بھی خامہ فرسائی کی بالخصوص عادل شاہی اور قطب شاہی شعراء نے اپنی شاعری میں اس دور کے سماجی اور تہذیبی اور ثقافتی حالات، رسم و رواج، مراسم شادی و بیاہ، عید میلاد، شب برات، بسنت، نوروز، سالگرہ وغیرہ کے موقعوں پر نیچرل شاعری کے علاوہ الوان نعمت کی تفصیل کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ذیل میں دکنی مثنویوں کی ایک فہرست دی جا رہی ہے۔ جن میں قدیم دکنی تہذیب و تمدن، طرز معاشرت اور مطبخ داری کے لوازمات، رزم و بزم کے واقعات نہایت شرح و بسیط کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

فہـــرست

(۱) یوسف زلیخا از احمد گجراتی (۲) قطب مشتری از (وجہی)
(۳) سیف الملک بدیع الجمال (غواصی) (۴) جنت سنگھار از ملک خشنود
(۵) میزبانی نامہ از حسن شوقی (۶) پھول بن از ابن نشاطی (۷) گلشن عشق از نصرتی (۸) داستان بہرام گور و بانوی حسن از (امین) و (دولت) بیجاپوری[۱]
(۹) داستان بہرام گور و گل اندام از طبعی گولکنڈوی[۲] (۱۰) ماہ پیکر از جنیدی[۳]
(۱۱) یوسف زلیخا از امین گجراتی (مخطوطہ، نقل از راجہ محمود آباد لائبریری[۴])
(۱۲) یوسف زلیخا از ہاشمی (۱۳) باغ جان افزا یا مخزن عشق از (وجدی) ویلوری
(۱۴) پنجۂ آفتاب از مذنب بنگلوری (۱۵) تکملۂ پھول بن از ابن جعفر
(۱۶) مثنوی سرو و شمشاد از غلام قادر (سامی) اورنگ آبادی
(۱۷) شیخ محمد (حافظ) (فاضل) سورتی کی فارسی مثنوی - بہرام گور و بانوی حسن[۵]
(۱۸) مثنوی بہرام و گل اندام از (امین) سبزواری (فارسی - ایران[۶])

---

۱ داستان بہرام گور و بانوی حسن از امین و دولت بیجاپوری
۲ داستان بہرام گور و گل اندام از طبعی گولکنڈوی
۳ ماہ پیکر از جنیدی مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر مطبوعہ
۴ نقل از نیشنل میوزیم پاکستان (مملوکہ راقم)
۵ (مملوکہ راقم)
۶ داستان بہرام گور و بانوی حسن از فاضل سورتی

دکینوں کی مہمان نوازی کے چرچے عام ہیں اس ضمن میں مولوی نصیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں کہ:

"عام طور سے شادی بیاہ کے موقعہ پر ضیافتوں کا سلسلہ طویل ہوتا تھا. یعنے منجے، ساچق، مہندی، عقد خوانی، چوتھی، ولیمہ، جمعگی کی تقریبات میں حسب حیثیت ضیافتیں ہوتی تھیں. طویل دستر خوان بچھائے جاتے اور ہر شخص یا چار اشخاص کے سامنے لوازمات سلیقہ اور تکلف سے چنے جاتے کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ دس پندرہ بلکہ بیس لوازمات ہوتے. مہمان نوازی دکھنی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت تھی دستر خوان کے تیار ہونے پر اور کھانے کے لئے مہمانوں کو طلب کرنے، ہاتھ دھلانے، پان سپاری تقسیم کرنے وغیرہ کا جو سلیقہ ہوتا اور انکساری کی جاتی وہ اپنی نظیر آپ تھی[1]."

یہ صحیح ہے کہ حکومت بہمنی اور دکن کی دوسری سلطنتوں یعنی قطب شاہی، عادل شاہی، احمد شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی وغیرہ کے دور کے شاہی مطبخوں کا حال اس قدر تفصیل سے دستیاب نہیں ہے البتہ گولکنڈہ کے بادشاہوں نے تہواروں کے ساتھ اپنی سالگرہ کے موقعوں پر جو دعوتیں دی ہیں ان کا قدرے ذکر ملتا ہے درصل یہی پہلو اس مضمون کا محرک ہے. گذشتہ سال حیدرآباد کے سفر کے دوران ڈاکٹر حسن الدین[2] صاحب وظیفہ یاب آئی، اے، ایس نے اپنے گھر ایک فرانسیسی محترمہ سے متعارف کروایا. موصوفہ فرانس سے حیدرآباد کے پکوانوں Culinary Art of Deccan پر کام کر رہی ہیں. موصوفہ کے استفسار پر راقم نے دکنی کی چند ایسی مثنویوں کا حوالہ پیش کیا. جن میں دکنی کھانوں کی تفصیل موجود ہے اس کے بعد راقم نے تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رکھا. مدارس کے سفر میں مطبوعہ نسخۂ شاہجہانی ہاتھ آیا بمبئی میں کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے نو دریافت مخطوطات[3] میں راقم کو مطبخ داری کے فن پر دو کتابیں

---

۱ دکھنی تہذیب کا پس منظر، مقالہ از مولوی نصیر الدین ہاشمی (دکنی اردو ص ۸۰)

۲ ڈاکٹر حسن الدین احمد، عزیز ویلا، سلطان پورہ، حیدرآباد

۳ ان مخطوطات کا تفصیلی تعارف آئندہ کسی مضمون میں کیا جائے گا

ہاتھ آئیں۔ ان سے استفادہ کیا گیا۔ دراصل راقم کو عہد عالمگیر کے ایک دانشور، شاعر، عدیم المثال نثر نگار اور شاہی مطبخ کے افسر اعلیٰ، نعمت خان عالی کی تصنیف «خوان نعمت» کی تلاش ہے اگر یہ کتاب ہاتھ آجاتی تو نسخۂ شاہجہانی سے اس کا بلحاظ فن مقابلہ حیرت انگیز نتائج برآمد کرسکتا تھا کیونکہ نعمت خان عالی ایک زمانے تک بلکہ گولکنڈہ کے قلعہ کی تسخیر میں اورنگ زیب عالمگیر کا ہمرکاب بھی تھا۔ مزید چھان بین کے بعد قطب شاہوں کی رواداری کی ایک مثال ایسی سامنے آئی کہ اس سے فی زمانہ سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بقول «غالب»: وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو[1]

دکنی سلاطین کے مطبخ اور باورچی خانوں کے اعلیٰ[2] افسر اکثر ہندو رہتے چنانچہ قطب شاہی سلطنت میں نرسنگ راؤ صاحب (سابق وزیر اعلیٰ) کے مورث اعلیٰ اس عہدے پر مامور تھے۔ مغلیہ مطبخوں کے چاشنی گیروں کی طرح دیگر فرائض کے علاوہ ان کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ خاصہ کے کھانوں میں زہر وغیرہ کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس خصوصی اہتمام کے لئے ہندو اصحاب پر پورا اعتماد کیا جاتا تھا۔ ان حقائق کے پیش نظر قطب شاہوں کی اعلیٰ ظرفی پر جسقدر فخر کیا جائے وہ کم ہے۔

صوفیاء کرام نے بھی دکن میں وسیع القلبی اور مذہبی رواداری کا بھرم قائم رکھا وقت کے تقاضوں کے ساتھ مسلمان بتدریج دکن کے مختلف حصوں میں آباد ہوئے انھوں نے مشاہدہ کیا کہ یہاں کے بعض اقوام گوشت کھاتی ہیں اور بعض فرقے گوشت سے پرہیز کرتے ہیں اور جو فرقے گوشت کھاتے ہیں وہ بھی گائے کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔ دکن میں آنے والے اکثر صوفیاء نے اپنے مریدوں کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت کردی تھی۔

---

۱ دیوان غالب از غالب

۲ دکھنی ادب کا تہذیبی پس منظر مقالہ از نصیر الدین ہاشمی (ص ۷۸)

مولوی نصیرالدین ہاشمی مرحوم دکن میں پکوانوں کی مروجہ اقسام پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ :

" دکن کی بہمنی سلطنت اور اس کے بعد دوسری سلطنتوں میں مختلف ممالک کے افراد کا اجتماع ہوا ۔ اس لئے مختلف اقسام کے کھانے یہاں رواج پانے لگے ۔ دکن کے باشندوں کی غذا روٹی بھی رہی اور چاول بھی ۔ پھر روٹی کے لئے گیہوں جواری ، باجرہ استعمال ہوئے ۔ جوار اور باجرہ کے قطع نظر گیہوں کی روٹی کے متعدد اقسام مثلاً نان ، شیر مال ، باقر خانی ، نان بادام ، روغنی کلچے ، کاغذی چپاتیاں باریک خمیری ، پراٹھے[1] ، ریشمی پراٹھے ، رومالی روٹی ، کلچے ، پھلکے وغیرہ ۔ چاول کے کھانوں کے اقسام میں خشکہ ، کھچڑی ، قبولی ، بریانی ، پلاؤ کے قطع نظر خود ان کے کئی اقسام ہوتے مثلاً کھچڑی کے لئے چنے کی دال وغیرہ استعمال ہوتی ۔ بریانی اور پلاؤ کے بیسیوں اقسام تھے اور مختلف ناموں سے موسوم تھے ۔"

روٹی ، چاول کے ساتھ سالن کا ذکر ضروری ہے ۔ دکن میں گوشت اور ترکاری کے مختلف اقسام کے سالنوں کا رواج رہا ہے ۔

" گوشت کے کباب کے کئی اقسام ہوگئے ۔ مثلاً نرگسی کباب ، دم کے کباب سالم بکرے کا دم پوحت ۔ مرغ کے علاوہ کئی پرندوں کا گوشت ، مثلاً بٹیر ، تیتر صناف ، بط ، کبوتر اور دوسرے اقسام کے پرندے ۔ پھر ہرن ، خرگوش وغیرہ کے علاوہ مچھلی ، جھینگہ کے سالن مختلف طریقوں سے تیار ہوتے تھے نمکین کھانوں میں سالن کٹ اور بگھارے بیگن مشہور ہیں قورمہ اور خلیان مختلف اقسام کے ہوتے ۔ دکن میں نمکین کھانوں کی طرح شیرین کھانوں کے اقسام بھی سیکڑوں کی تعداد میں تھے ۔ خصوصاً مدارس میں اس کثرت سے مٹھائیاں تیار ہوتی تھیں کہ وہ شاید ہندوستان کے کسی علاقہ میں نہیں ہوتیں ۔ ارکاٹ کے نوابوں کو کھانے کا بہت شوق تھا ۔ چنانچہ مدراس کی کئی کتابوں میں کھانوں کی تفصیل درج ہے ۔ روٹیوں کے اقسام کے بعد پلاؤ کے اقسام ، قورمے کی کئی اقسام پھر قبولی ، یخنی ، مطبخی

۱ پراٹھے

خشکہ، مصالحہ، مصالحہ دار کھچڑی، خلیے کی طرح کے مثلاً سادہ خلیہ[1]، مرغ کا خلیہ، تیتر و بٹیر کا خلیہ، بیگن کا خلیہ، ترکاریوں میں ہمہ اقسام کی ترکاریاں، ترائی، کریلا، پالک میتھی، کباب کے کئی اقسام مثلاً قیمہ کباب، جہاں کڑی کباب، شاہی کباب، سیخ کے کباب، نمکین کھانوں کے بعد شیرین کھانوں مثلاً سیویاں، دودھ کی فرنی، ساق عروس، لڈو پوریاں، سوالیاں، پری کف، اباوچ، خس کے لڈو، وغیرہ عام طور سے جو بازار میں شیرنی فروش کی دوکانوں میں ہوتیں. ان میں دو قسم کی مٹھائیاں ہوتی تھیں ایک ہندوستان کی قدیم مٹھائیاں مثلاً لڈو، پیڑے وغیرہ اور مسلمانوں کی ایجاد کی ہوئی مٹھائیاں مثلاً جلیبی، برفی حلوا وغیرہ[2].»

اب ہم ذیل میں بہ اعتبار قدامت یکے بعد دیگرے دکنی مثنویوں سے ماخوذ اقتباسات پیش کرینگے جن کا شاہی یا عوامی دستر خوان اور اسکے لوازمات سے تعلق تھا.

۱ میزبانی نامہ از حسن شوقی

حسن شوقی ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ع ایک جہاں دیدہ اور جہاں گرد شاعر تھا. شوقی نے نظام شاہی سلطنت، عادل شاہی حکومت اور قطب شاہی دربارکی چمک دمک دیکھی ہے اس نے ایک رزمیہ مثنوی فتح نامۂ نظام شاہ لکھی اور ایک میزبانی نامہ عادل شاہ یادگار چھوڑا ہے اس کا کلام اپنے دور کا آئینہ دار اور اس کی قادر الکلامی پر دال ہے. ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیوان حسن شوقی نہایت دیدہ ریزی کے ترتیب دے کر شائع کردیا ہے. چنانچہ حسن شوقی الوان نعمت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

کیتا بار دارتے دریا شکوہ	زلبیاں کے جالے و حلویاں کے کوہ
دھرے تھالِ زریں میں بالا و زیر	دراجاں کے ڈھگلے، بٹیراں کے ڈھیر

---

۱ حیدرآبادی ہونے کی وجہ سے مولوی صاحب نے «ق» کو «خ» تحریر کیا ہے

۲ دکھنی ادب کا تہذیبی پس منظر از ہاشمی ص ۷۸ ـ ۷۹

سو بریاں و بغرا و قلیا سو بہاس
سو مچھلیاں کے کھنڈرے انڈیاں کے راس

بلینبو و نیبو و سرکا مہیر
سو جغرات، ونعنا و پدنا پنیر

کمیت و کامیخ نارے رہیف
تنک ناں، مانڈے، کماچاں لطیف[1]

الوان نعمت کی تفصیل -

(۱) زلیبیاں (جلیبیاں) (۲) حلویاں حلوے کی جمع (کئی اقسام کے حلوے)
(۳) دراج (تیتر) اور بٹیر (۴) بریانی (۵) بغرا (۶) قلیا (قلیہ/خلیہ)
(۷) تلی ہوئی مچھلیوں کے ٹکڑے (۸) نعنا - نعناع (پودینہ) (۹) انڈیاں (انڈے کی جمع) (۱۰) جغرات (دہی) (۱۱) پدنا (پودینہ) (۱۲) پنیر
روٹیوں کی اقسام : (۱۳) تنک نان (۱۴) مانڈے (۱۵) کماچاں

حسن شوقی نے جن الوان نعمت کا ذکر کیا ہے ان میں «زلیبیاں» اور «مانڈے» دو ایسے پکوان ہیں جن کا سر زمین ہند سے خصوصی تعلق ہے۔ ایران میں روٹیاں صرف تندور کی جاتی ہیں۔ «مانڈے» کا تصور ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ مخصوص روٹی دکن میں مروج ہے اور آج بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ بنائی جاتی ہے اور تری دار قلیہ کے ساتھ چورکر کھائی جاتی ہے۔

۲ مثنوی یوسف زلیخا از شیخ احمد شریف گجراتی[2]
(۱۵۸۰ - ۱۵۸۵ کے درمیان)

اس مثنوی کا دکنی اردو کی قدیم ترین مثنویوں میں شمار ہوتا ہے۔ ادبی اور لسانی اعتبار سے اس مثنوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے مبسوط مقدمہ کے ساتھ اس مثنوی کو تصحیح متن کے ساتھ شائع کیا ہے۔ عہد قطب شاہیہ کی سربر آوردہ مثنویوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ شیخ احمد نے عنوان «خبرداری طعام او داشتن» (ص ۳۱۱) کے تحت کھانوں کی مختصراً تفصیل

---

۱ میزبانی نامہ، از حسن شوقی (مطبوعہ پاکستان) مرتبہ جمیل جالبی (ص ۴۴ شعر نمبر ۱۹۸ تا ۲۰۲)

۲ مثنوی یوسف زلیخا از شیخ احمد گجراتی مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر (۱۹۸۳ع)

دی ہے ملاحظہ کیجئے۔

کرے سنجوگ کھانے کا بہود دمات
رکھے جم گرم مطبخ دیس ہور رات
دھرے نعمت سوں، نعمت خوان معمور
طبق، طبلے شیرینی سوں معمور[1]
تگر سو ہے پھلوں میویاں تھے رنگ رنگ
چونے اس رنگ تھے گلزار رنگ رنگ
کیتے آپار جے جگ میں کندوری
نہ ہونے سفرا بچھاؤں دھرت پوری
سو چنیاں نعمتاں دوایا نہ جاوے
مگر کوئی بھاگ ونت جنت میں پاوے[2]

(۱) شیرینی (۲) پھل (۳) میوے (میویاں)
(۴) پوری (دھرت پوری - دہری پوری)

شیخ احمد شریف نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ متعدد الوان نعمت دستر خوان کی زینت تھے۔ ان کے نام انھوں نے نہیں دیئے۔ البتہ گوشت کے کھانے (کندوری) اور پوری کا ذکر ضرور کیا۔ ان پکوان کا تعلق بھی ہندوستانی کھانوں سے ہے۔

۳ قطب مشتری[3] از ملا وجہی

ملا وجہی محمد علی قطب شاہ کے ملک الشعراء تھے۔ ان کی مایہ ناز تصنیف قطب مشتری ۱۰۱۸ھ ہے۔ وجہی نے صرف نو ملک کی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل نہیں دی۔

---

۱ مثنوی یوسف زلیخا از شیخ احمد گجراتی مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر (ص ۳۱۱)
۲ ایضاً (ص ۴۲۵)
۳ مثنوی قطب مشتری از ملا وجہی مرتبہ ڈاکٹر عبد الحق (ص ۱۸)

« صفت میزبانی »

خوشیاں سوں جو شہ میزبانی کنائے ــــو ترلوک کے لوگ مہمان آئے
نوبہاں نعمتاں نو فلک بیج[1] کر لے کر آئے ڈھوکر ملک شہ کے گھر
عجائب طبق ہے دھرت پان کا کہ ڈھانکے ہے سرپوش آسمان کا
(ص ۱۸)

صفت مجلس طرب :-

شراب ہور صراحی، نقل[2] ہور جام ہوئے مست مجلس کے لوگاں تمام

۴ ضمیمہ پھول بن از محمد حیدر ابن محمد جعفر

محمد حیدر نے اپنے آپ کو ابن نشاطی (مصنف مثنوی پھول بن[3] ۱۰۶۶) کے اتباع میں ابن جعفر کہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس نے ان اشعار کا پھول بن میں اضافہ کیا۔ یہ اضافہ پھولبن کی تصنیف کے سو سال بعد یعنی ۱۱۶۶ ھ میں ہوا۔ اس میں ۲۴۱ اشعار ہیں۔ محمد حیدر کے یہاں اکثر پکوانوں کے نام ہندوستانی ہیں۔ زلبی کو صاف طور پر جلیبی اور خصوصاً پیٹھے کے مربے کا تذکرہ کیا ہے۔

مٹھائی بہوت خوش بادام کی کــر جلیبیاں ہور سموسے بھی رکھے بھر
مٹھائی میں تھے سموسے بہوت خوب تھا بادام کا حلــوا بھی محبــوب
ترنجـــی ہور نارنجـــی مــربــا رکھے پیٹھے کا بـــور بھی آم کالیا[4]

۱ بھیج کر ہونا چاہئے
۲ نقل، شراب کے بعد ذائقہ کے طور پر کھائی جانے والی چیزیں ، کباب، میوہ مٹھائی
۳ مثنوی پھول بن از ابن نشاطی مرتبہ ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی (ص ۷۹) ۱۹۷۸ ع مطبوعہ ترقی اردو بورڈ، نئی دھلی
۴ دیکھئے یورپ میں دکنی مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی اور اردو شہ پارے از ڈاکٹر زور

پکوانوں کی تفصیل :-

(۱) بادام کی مٹھائی (بادام کی برفی) (۲) جلیبی (۳) سموسے (۴) بادام کا حلوا
(۵) تسرنجی (چکوترہ) ایک قسم کا بڑا نیبو (٦) نارنجی کا مربا
(۷) پیٹھے کا مربا (پیٹھے کا مربا) گول کدو سے مشابہ ایک پھل جس کی مٹھائی اور مربہ بناتے ہیں۔ (۸) آم کا مربا

۵ ماہ پیکر از جنیدی[1] (۱۰٦۴ ھ - ۱٦۵۳ع)

شیخ احمد جنیدی بقول سید جعفر صاحبہ مہدوی سلسلے کے بزرگ اور شاعر تھے۔ اس مثنوی میں عشقیہ، صوفیانہ اور مذہبی خیالات کی نمائندگی ہے۔ فی الوقت ہمارا موضوع دکنی الوانِ نعمت ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں : اس مثنوی میں کھانوں کی بجائے شربت اور لوازمات ضیافت کی تفصیل ہے۔

که طبقاں میں سارے پیالے دھرے — گگن پر چاند سور تارے جڑے
که سرپوش موتیاں کا مخمل تمام — که زرباف نیلک و زر کا تھا کام
لے آکرکے ڈھانکے سو طبقاں اوپر — کیتے راس طبقاں ہمہ سر بسر
فراشاں دھولائے ہاتھ جو پھر تمام — دیتے پر یکس ہات شربت کا جام
پئے خاص ہور عام شربت قبول — سوگند ہور میٹھا امولک امول
که مکھ پوچھنے سب رومالاں دیتے — پٹیاں پاں لیتے جتے تھے وتے
کھلائے کھان مجلس کوں سارے تمام — مشک زعفراں گل لگائے خاص عام

(۱) میزبانی کے لوازمات - طبق، پیالے، سرپوش موتی و مخمل کے، طبقوں کی راس (۲) مہمانوں کے ہاتھ دھلانا (۳) شربت (۴) خاص و عام کو دعوت دی گئی (۵) خوشبو دار قیمتی اور نایاب شربت (٦) منہ صاف کرنے کے لئے نوالیں اور رومال (۷) مشک اور زعفران (۸) پان وغیرہ

۱ مثنوی ماہ پیکر از جنیدی مرتبہ سیدہ جعفر (۱۹۸٦ع) ص ۲۱۷
نوٹ : راقم اس مثنوی کو ازسرنو مرتب کرچکا ہے۔

۶ مثنوی گلشن عشق از ملا نصرتی ۱۰۶۸ھ
مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق ۱۹۵۲ع کراچی، پاکستان

دکنی مثنویوں میں ملا نصرتی کی مثنوی "گلشن عشق" کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں پچاس سے زیادہ پکوانوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

دلاں تو تماشے سوں مائل اگھائیں — اگھائی کندوری خرچنے لجائیں
نکہہ سفرہ تھی اس جہاں کی بہشت — ہریک جنس نعمت ہے طوبیٰ سرشت
جنے جس کندوری تی یک چیز کھائی — اونے لاک لذت اپس مکھ میں پائی
ہر یک رنگ پرکار کا خوش پلاؤ — اتھا پھول بن یک روشن سہاؤ
ہوئے تھے کندوریاں تی رنگیں چمن — کھلے تھے سو پکواں کے پھول بن
مزعفر نکہہ زعفراں زار تھا — قبولی میں سوسن کا مہکار تھا
پھرا راج خشکا اتھا او سو باس — کیا موگرے کی کلیاں کو اوداس
سہانی تھی کھچڑی مسالے کی یوں — نشیمن ہے پھل پھول پانا ہے جوں
چمدر نے لایا کنول پھول بار — ہوا قلیہ نرگس نمن لالہ زار
کوتھمیر اگے بار دونا گیا — پودینے نے مروے کنیں رد کیا
گل چاند کا کاک پائے خطاب — کماچاں دیسے جوں گل آفتاب
کدو ہور چچونڈے، تورئیں کے بڑے — قبولی کے گھر بیل منڈوے چڑے
رکابی کا گھنوسوں بسر، آلا ہوا — کلی بھویں چنے کا بنجالا ہوا
ہریا کاچ سوے دسیں سبز بن — ہوا پاچ میتھی تی سارا چمن
لمایوں کرے سیم اپس ہات تند — رہے لاج منڈوا ہو ارگند کند
جو کتلے ہوئے دال میں مل کے گھول — رکھے ہنس گل زعفرانی یہ بول
برابیاں و پخنیاں کی ڈونگر تلار — لہوے ہور دراجاں کی موزوں پکار
بھریا ڈوہ میں کاسیاں کے روغن ہونیر — تری نس میں پھلیاں کی کھنڈری ہوتھیر
نچھل سیروے میں وطن کر رہیاں — بدخ، مرغ، و مرغیاں و مرغابیاں
کھڑا نیر گھنو بسوں اسی کھیر پر — اوپر چور بالو سو چینی شکر[1]

---

۱ گلشن عشق از نصرتی مرتبہ عبد الحق (ص ۱۸۲ - ۱۸۳)

کھڑے دو جھجے خوش مٹھائی کے نیٹ   شکر پارہ ہور میشمی حسکی اینٹ
چونا جسکی کچھ کا سو ابلوچ پاک   سڑم لہار پشمک ہوی چاک چاک
نہ نابات مصـــری پتھر یشم کی   صفائی میں عینک دسیں چشم کی
صفا شہد سوجی کا حلوائے تر   ســـو پنبی ہونی جوڑے کچ بہتر
جو اِت گھونٹیا شیرہ نرم چارہ ہوا   غلیفے کا چونا سہ بارا ہوا
سموسے سموسے کی سڑماں کی لہار   شکرپارے کا فرش انگن کے منجھار
مشبک کی جاگا زلیبیاں تمام   رنگا رنگ پالودہ فرنی کے جام
بھرے دود کانسے چھوٹے چمہ بچے   ڈولیں حس میں چمچوں کی ناواں سچے
ہر یک کاسہ یک بھانت شربت دھریا   دس آوے یک یک چشمہ امرت بھریا
شکر کی اتھی گرد میں چار سو   چنیاں ریوڑیاں ہور بتاشے لڈو
ہریک جنس میوے کا تھا ڈھگ وہاں   ہوا تھا او ہر قصر کوں مایہ بہاں
کدوری جو ہوی بار جوں نوبہار   کپے تس میں گل گشت مہماں دار
کیا جن سرعقــر طرف حوش گذر   کلی دل کی ہنسنے لگی کھل ادھر
قبولی کی بندر تی ہویں سرفراز   جو مرغی کے سینے کا سپڑیا جہاز
جو شیروے ہت غرق ہونے پہ آئے   تیرا کر کدو بیگ گڑکی لگائے
ملیدے کے جن اینک پر رخ کرے   چھولی بوٹ چھینے میں گھیو کے جورے
جو بنیڑیاں سو سویاں کی سیوال میں   گونتھیا دودھ ہور گھئو کی کنجال میں
ہوا تھا او مجلس میں سرکہ شراب   پنیر اس انگے ہو رمیا تھا کباب
جنے مدھاو چاکھی تو لک مکھ کوں کھول   وہیں ہو آدک اشتہا میں کلول
کئے جوں چھجیاں کی طرف یک جو یک   چڑی گـــرد ابلوچ کی حلق لگ
جنے تس ایکن میں او چلنے کوں جائے   شکر پارہ کا فرش گڑگیاں پہ لائے
پھراوے نظر جن سرنگ جام پر   چھمر میں زلبی سے سنپڑے نظر
مٹھائی تی جن سو بھرا کر تھکے   جو کھاری کی ہوی ہاٹ پکڑے پھکے
چنپیاں ریوڑیاں کی لڈو کی بق   انپڑنے لگی آ تھنڈی ہـــور ت[illegible]

لگی میشمی یا اندرسے کی اینٹ   ملک دم سے میں نہ بات آئے [illegible]
جو کوئی جا جو پشمک کے بھانڈی پڑے   لگے یو چانیاں کے تس کور[illegible]

کتنے وقت رہ ہات موں سنگ میں | میٹھی اور کھاری کی تھی جنگ میں
لکھوں کیا میٹھائی کی لذت اگر | مرے ہاتھ میں ہو قلم، نے شکر
سلونی، جو کھارے کی کاڑوں جو بات | نمک دان ہوئے چھبیلی دوات
اگھاتا ہوا خلق جب کھا کے کھان | دملا ھت دیئے مانگے سب کو پان[۱]

گلشن عشق کا تعارف : ملا نصرتی علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ ھ مطابق ۱۶۵۶ ع کے ملک الشعراء تھے انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی قدیم تہذیب و معاشرت کی نصرتی نے نہایت خوبی سے عکاسی کی ہے ۔ علم و ادب کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ علی عادل شاہ بھی ایک سخن پرور بادشاہ تھا لہذا نصرتی نے سماجی پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ذیل میں ۵۲ پکوانوں کی تفصیل درج ہے جو شاہی دسترخوانوں اور امراء کے مطبخوں کی زینت ہوا کرتے تھے ۔ نصرتی نے ۱۲ ہندوستانی سبزیوں کے نام درج کئے ہیں۔ سبزیوں کے اتنے نام قدیم اردو کی کسی مثنوی میں نہیں پائے جاتے ۔ اسی طرح پندرہ کے قریب میٹھی چیزوں کے نام گنوائے ہیں جن میں لڈو اور ریوڑی کا خصوصی ذکر ہے ۔ اس کے علاوہ ھیشمی، پشمک اور اندرسے جیسی چیزوں کا ذکر بھی ہے ۔ جنوبی ہند کی پسندیدہ شیرینی "شیرہ" (دودھ اور روے سے بنی ہوئی میٹھائی) کی طرف اشارہ بھی ہے ۔ البتہ نصرتی نے کباب کے اقسام پر خامہ فرسائی نہیں کی جبکہ دیگر مثنویوں میں کباب کے مختلف اقسام کی وضاحت کی گئی ہے[۱] ۔

مثنوی گلشن عشق میں الوان نعمت کی تفصیل - کل ۵۲ اقسام

۱ کُسندوری (کُسُنْدَروی) دعوت، دستر خوان ۲ سو (۱۰۰) پکوان
۳ مُزعفر (زعفران میں رنگے ہوئے میٹھے چاول کا پلاؤ) ۴ قبولی (چنے کی دال اور چاول ملاکر سایا گیا پلاؤ) ۵ خشکہ (خشکا) ۶ مسالے کی کھچڑی (مسالے بھات) ۷ چقندر (چقندر - شلجم سے مشابہ ترکاری) ۸ قلیہ (توے

۱ گلشن عشق از ملا نصرتی (۱۰۶۸ع) ص ۱۸۲ تا ص ۱۸۵

۱ نوٹ : گلشن عشق میں ۵۲ الوان نعمت کا ذکر ملتا ہے ۔ دیکھئے فہرست

پر بھونا گوشت ۔ گھی میں بھونا ہوا شوربے دار گوشت ۹ کوتھمیر (ہرا دھنیا) ۔ دونا ۔ پودینہ ۔ مروا (خوشبو دار پتیاں) ۱۰ کاک : روٹی (گل چاندنی کی طرح ۱۱ کدو (کدّو) ۱۲ چچونڈے (چچینڈا : ککڑی سے مشابہ پھل) ۱۳ تورئیں کے بڑے (تورانی) ۱۴ قبولی (کھچڑی) ۱۵ بنجالا (بیگن اور چنے ملا کر) ۔

۱۶ سونے کی بھاجی ۱۷ میتھی کی بھاجی ۱۸ سیم کی پھلی

۱۹ ارگد کد ۲۰ کتلے (جو کے بنے ہوئے دال کے ساتھ) ۲۱ بُرانیاں (بگھارا ہوا دہی) ۲۲ یخنیاں (شوربا ۔ ابالے ہوئے گوشت کا پانی ۔ سوپ)

۲۳ لہوے (دکی) (بٹیر) ۲۴ دُراجان (تیتر) ۲۵ مچھلیوں کے کھنڈرے

۲۶ شوربے دار بدخ (بطخ) ۲۷ شوربے دار مرغ ۲۸ شوربے دار مرغابیاں ۲۹ کھیر جس پر گھی کی تہہ جمی ہو ۳۰ شکر پارے کی تہیں ۳۱ ھیشمی کی تہیں (مٹھائی کی ایک قسم) ۳۲ چونے کی طرح صاف ابلوج (مصری) ۳۳ پشمک (مٹھائی کی ایک قسم) ۳۴ یشم پتھر کی طرح سخت نابات (مصری) ۳۵ سوجی کا حلوہ ۳۶ شیرہ (دودھ اور سوجی سے بنا میٹھا) ۳۷ سموسے کے ڈھیر کے ڈھیر ۳۸ انـــدرسے (ایک قسم کی مٹھائی جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں ہوتی ہے) ۳۹ زلیبیاں (جلبی) ۴۰ پالودہ (فالودہ) ۴۱ فرنی ۴۲ دودھ کے بھرے ہوئے پنڈے ۴۳ مختلف اقسام کے شربت، جوں آبِ حیات ۴۴ ریوڑیاں ۴۵ بتاشے ۴۶ لڈو ۴۷ ہر جنس کے میوے ۴۸ ملیدے ۴۹ سیویاں ۵۰ سرکہ ۵۱ پنیر ۵۲ کباب ۵۳ سلونی ۵۴ کندرو ۔ ایک قسم کی ترکاری

۷ یوسف زلیخا از محمد احمد شریف گجراتی (نیشنل میوزیم، کراچی ۷ ۱۴۳ ۔ ۵۶ نمبر[1])

عاجز شیخ احمد گجراتی کے فرزند ارجمند تھے ۔ اپنے والد کے تتبع میں اسی موضوع پر ۸۵۹ اشعار کی مثنوی ۱۰۴۴ ھ ۔ ۱۶۳۴ع میں شگفتہ اور رواں مثنوی لکھی ہے ۔ اس کا واحد نسخہ نیشنل میوزیم کراچی پاکستان میں ہے راقم

۱ مثنوی یوسف زلیخا از محمد بن احمد (زیراکس مملوکہ راقم)

نے اسے مرتب کرلیا ہے ۔

تماشا ہر یک دھات کا رنگ برنگ
منگائے کندوری نہ کر کچھ درنگ
خرچ کر کندوری پوریاں میں سب
طبق میوے کے دھرے لیا سو سب شعر نمبر ۵۵۰

۱ کُندوری (کُندَوری)   ۲ میووں کے طبق

۸ یوسف زلیخا اور امین گجراتی

امین گجرات کا معروف شاعر ہے بقول ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی
«اس سے ایک بزمیہ مثنوی یادگار ہے ۔ اگرچہ امین کا نقطہ نظر
تبلیغی اور متصوفانہ ہے مگر مثنوی کے اجزائے ترکیبی بزمیہ کے
ہیں ۔»[1]

یہ امین گجرات کے اس امین سے علحیدہ ہے جس کی مثنوی بہرام گور و بانوی حسن (۱۰۵۰ ھ) دستیاب ہوتی ہے ۔ امین نے اڑتالیس پکوانوں کا ذکر کیا ہے جو گجرات میں مروج تھے ۔ ان میں خصوصی ذکر «حلوانوں کے قلیے»[2] کا ہے گجرات کی مخصوص میٹھائیوں «امرت پاک» اور «گوند پاک» کا ذکر بھی ہے ۔ امین کی یوسف زلیخا کا سنہ تصنیف ۱۱۰۹ ھ ہے ۔ امین کی تین مزید مثنویاں اور ہیں ۔

امین : الوانِ نعمت کے اقسام

میٹھائی سب جنس کی کیتی موجود		جلیبی اور لڈو بیس اور دود (ھ)
شکر پارہ نے میصوف اور بتاشے		اَنے مسرکیاں ایلاچی دانے خاصے
دہیداں گوند پاک اور حلوائے سون		بھی امرت پاک سَیق تھے بھرے خوان

---

۱ گجری مثنویاں از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (ص ۹۹)
۲ مادہ جانور کے شکم سے نکلے ہوئے بچے کے گوشت سے بنایا ہوا قلیہ ۔

قرصِ شکــــر کے اور لوزان پتانی   بھی حلـوائے تـر سیق قـابـاں بھرائی
حـــریش انی حـــلواے مغـــزی   بھی حلوا — اور حلوائے ســـونی
طبقِ صابونیـاں سیں بھرے تھے   کدوروں سیق خــــواواں بھرے تھے
مربے سب جنس کے لیائے تھے تاں   اچاراں سب جنس منگوائے تھے واں
سموسے، کوفتے، کلمے تلے تھے   کبـابـاں سیخ شـامی واں بھلے تھے
پلاؤ مـــرغ اور پلاؤِ مـاہی   پلاؤ رشـــتہ لایقِ بـادشـاہی
پلاؤ نـرگس اور پـلاؤ جمفی   مُـزعفـر، خشکـہ دم پخت، لـونی
متمن زیر بریـاں عـاش اور کھیر   ملایـاں، سیویـاں، شکـرانے شـــیر
کلیجی اور حــــلوانوں کے قلیے   بھی لاوے، تیتراں اور مـرغیوں کے
قمـاچے، نـان اور نـان خطـائی   بھی بـاقـر خـانی اور بے حد مٹھائی[1]

پکوانوں کی تفصیل : کل ۴۸

۱ جلیبی ۲ بیسنی لڈو ۳ شکر پارہ ۴ میصوف (بیسن کی بنی ہوئی ایک مٹھائی)
۵ بتاشے ۶ مرکیاں (چھوٹی چھوٹی پھلکیاں) ۷ ایلاجی دانے ۸ دمیداں ؟
۹ گوند پاک ۱۰ حلوائے سون (سوہن) ۱۱ امرت پاک ۱۲ قرص پاک
۱۳ لوزاں[2] (بادام کا حلوہ) ۱۴ حلوائے تر ۱۵ حریش[3] ۱۶ حلوائے مغزی
۱۷ حلوائے سونی (سوئیاں) ۱۸ صابونیاں ۱۹ کدوریاں ۲۰ مربے
۲۱ اچار ۲۲ سموسے ۲۳ کوفتے ۲۴ کلمے (مسالے دار قیمہ بھری ہوئی بکرے کی انتڑیاں) ۲۵ سیخ کباب ۲۶ شامی کباب ۲۷ مرغ پلاؤ
۲۸ ماہی پلاؤ ۲۹ پلاؤ رشتہ ۳۰ پلاؤ نرگس ۳۱ پلاؤ جمفی (ترشی میں بنایا پولا) ۳۲ مزعفر ۳۳ خشکہ (پھیکے ابلے ہوئے چاول) ۳۴ دم پخت
۳۵ اونی (مسکہ) ۳۶ ملائی ۲۷ سیویاں ۳۸ شکرانے ۳۹ شیر
۴۰ کلیجی ۴۱ حلوانوں کے قلیے ۴۲ لاوے (لہوے) : بٹیر ۴۳ تیتر

---

۱ گجری مثنویاں از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (ص ۳۹ تا ص ۴۰)
۲ لوز : ایک مثلثی وضع کی تراشی ہوئی مٹھائی جس میں بادام ڈالی جاتی ہے۔
۳ حریرہ : میدے کو کھانڈ میں گھول کر بنائی جانے والی مٹھائی۔

۴۴ مرغیوں کا قلیہ ۴۵ قماچے (روٹیاں) ۴۶ نان ۴۷ نان خطائی
۴۸ باقر خانی (ایک قسم کی چپاتی جو مکھن، دودھ اور میدہ ملا کر تنور میں پکائی جاتی ہے) ۴۹ مٹھائیاں

۹ یوسف زلیخا از ہاشمی گجراتی

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ہاشمی سے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ :

"ہاشمی تخلص اور سید میراں نام تھا۔ یہ نابینا شاعر سید ہاشم بیجاپوری کا مرید مانا جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ مہدویہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے وطن کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے وطن گجرات یا برہانپور ہوگا (بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو) گجرات و دکن میں اس کی عمر گذری ہے۔ اس نے ۱۱۰۹ ھ میں وفات پائی۔ سخاوت مرزا صاحب کا خیال ہے کہ وہ برہان پور میں مدفون ہے۔"[1]

پچھائی خلتماں روٹیاں، سوجی کی پاک — کماچاں، کلیے چے و مانڈے تھے پاک
سو تھالیاں بڑی ہور کٹوریاں پہ پر — سموسے پوریاں سوں اں صفرا پر
و نرگس پلاؤ، یخنی پلاؤ تھا — اتھا مرغ پلاؤ بھی جا بجا
و شبت پلاؤ، تخم پلاؤ تھا ان — و شکر پلاؤ ہور پولاواں سو ان
مزعفر سو دم پخت تخم ہور خوش نلی — تندوری تھی مکری، و بچھلی تلی
تھا بیمسو پلاؤ اور رنگی پولاؤ — کیا ساری بیبیاں کو رنگی پولاؤ
تھا ماہی پلاؤ ہور بیضہ پلاؤ — پلاؤ ما مسالہ تھا خصّی پلاؤ
تھا تمر پلاؤ، باکلا پولاؤ — و نارنج پلاؤ و لُقماں پلاؤ
اتھا زیر بریاں و سرکہ پلاؤ — دیگر پاش پولاؤ و وُبنا پلاؤ
حریسا کٹک کھچکرتی دھات کا — کنچھر، پنیر وپیگا دھی بھات کا
کندوریاں کریلے بجالے اتھے — کدوہ گھیؤ ترئی، پیٹھو آلی اتھے

۱ گجری مثنویاں از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (ص ۱۲۵)

سرولی و سیویاں، تھولیاں، حلوہ شیر که شیر خورماں، فالودہ، فرنی و کھیر
ملیدے و چونگے حسریرا بھی کر رکھے سو دود بھات بور گھیو شکر[1]

پکوانوں کی تفصیل . کل اقسام ۵۵

۱ خلتماں (روٹیاں جن میں سبزی بھری ہوئی ہوں) ۲ سوجی پاک (شیرہ)
۳ کماچاں - کماچ کی جمع (روٹی کی ایک قسم) ۴ کاکچے (کلچے)
۵ مانڈے (پتلی گھیرے دار کاغذی روٹیاں جو الٹے گھڑے یا مخصوص مٹی کے کڑھائی نما برتن پر پکائے جاتے ہیں باورچی آٹے کے پیڑے کو بیل کر گول بناتا ہے . اسکے بعد انگلیوں اور ہاتھوں کی مدد سے بڑی چابکدستی سے گھماتا ہے . گھماتے گھماتے اس فنکار کے ہاتھ سر کے اوپر چکر کھانے لگتے ہیں اسکے بعد یہ روٹی اُلٹی کڑھائی پر ڈالی جاتی ہے.
۶ کاک (ایک قسم کی روٹی) ۷ سموسے ۸ پوریاں ۹ نرگس پلاؤ
۱۰ یخنی پلاؤ ۱۱ مرغ پلاؤ ۱۲ شبت پلاؤ (شبت) ؟ ۱۳ تخم پلاؤ
۱۴ شکرپلاؤ ۱۵ مزعفر (میٹھا پلاؤ) ۱۶ دم پخت (بھاپ میں پکا ہوا کھانا)
۱۷ تخم (اچھے تلے ہوئے) ۱۸ تندوری بکری (سالم تندور بکری)
۱۹ چھلیاں - تلی ہوئی ۲۰ نیمو پلاؤ ۲۱ رنگی پلاؤ (شش یا ہفت رنگی)
۲۲ ماہی پلاؤ ۲۳ بیضہ پلاؤ ۲۴ پلاؤ با مسالہ (مصالحہ) ۲۵ خصی پلاؤ
۲۶ ثمر پلاؤ ۲۷ باکلا پلاؤ (ابلے ہوئے اناج کا پلاؤ) ۲۸ نارنج پلاؤ
۲۹ لقماں پلاؤ (لقمہ) ۳۰ زیر بریاں ۳۱ سرکہ پلاؤ ۳۲ پاش پلاؤ (مسالے چھڑک کر بنایا گیا) ۳۳ ربا پلاؤ (انار کے عرق میں بنایا ہوا)
۳۴ حریسا ۳۵ کنچھر ؟ (دکنی لفظ) ۳۶ پنیر ۳۷ دہی بھات
۳۸ کندوریاں ۳۹ کریلے ۴۰ کدو ۴۱ گھیاترائی ۴۲ پیٹھی آلی (ادرک)
۴۳ سرولے (مولی سیویاں) ۴۴ سیویاں ۴۵ بجالے (بیگن) ۴۶ تھولی
۴۷ حلوۂ شیر ۴۸ شیر خورماں ۴۹ فالودہ ۵۰ فرنی ۵۱ کھیر

---

۱ یوسف زلیخا از ہاشمی : گجری مثنویاں از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (ص ۱۴۰ تا ص ۱۴۱)

۵۲ ملیدہ ۵۳ چونگے (دکنی لفظ) ۵۴ حریرا ۵۵ دود (ھ) بھات
۵٦ گھی شکر

بارھویں صدی ھجری کے پہلے دہے میں 'ہاشمی' نے گجرات میں " یوسف زلیخا " تصنیف کی قدیم اردو کے ماہرین نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ یہ نابینا شاعر گجرات سے دکن کی طرف آیا اور برہانپور میں سکونت اختیار کی اور یہیں مدفون ہوا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نابینا شاعر نے پچاس سے زیادہ پکوانوں کا ذکر نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں بیس قسم کے پلاؤ ہیں۔ اقسام پلاؤ اور خصی پلاؤ کا ذکر نسخۂ شاہجہانی میں بھی نہیں ہے۔ اس نوعیت سے پلاؤ کی اقسام میں یہ گجرات و دکن کا اضافہ ہے۔

دہی بھات، دودھ بھات، گھی شکر، میٹھی آلی، سروالے، چونگے اور تھولی وغیرہ دکن میں مروجہ کھانے ہیں۔ گجرات اور دکن میں غیر مسلم طبقہ آج بھی دہی بھات (چاول) اور دودھ بھات (چاول) کا شوقین ہے غیر مسلموں کے یہاں میٹھا کھانے کے پہلے (سنت طریقہ پر) یا آخر میں نہیں کھایا جاتا بلکہ کھانے کے دوران ہی میٹھا کھاتے ہیں اور کھانے کے اختتام پر دہی بھات یا دودھ بھات کھانے کا رواج ہے۔ دراصل ہاشمی کے یہاں کھانوں کی تفصیل گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ ضیافت میں مذہب و ملت کی تفریق نہیں ہے۔ میٹھی آلی یعنی شکر کے پاک میں ادرک کا عرق ڈال کر بنائی ہوئی شیرینی۔ یہ مٹھائی بھی غیر مسلموں میں مرغوب ہے۔ چونگے اور تھولی کا مسلمانوں کے یہاں رواج ہے۔ محرم کے مہینے میں چونگے بنائے جاتے ہیں گیہوں کے آٹے کی موٹی سی روغنی روٹی بنائی جاتی ہے اس میں انگوٹھے اور انگشت شہادت کے ذریعہ چٹکی سے گول گول دائرے بنائے جاتے ہیں۔ عورتیں اسے بڑی تیزی سے بنالیتی ہیں پھر ان دائروں میں شکر کا باریک سفوف پھیلایا جاتا ہے اور اس پر گرم گرم خالص گھی کی تہہ بچھائی جاتی ہے گویا یہ مسلمانوں کی پورن پوری (پورن پولی) ہے۔ یہ مثنوی اس امر کی غماز ہے کہ گجرات میں دکن سے زیادہ پکوان مروج تھے۔

(باقی آئندہ)

اردو یک بابی ڈراموں میں موضوعاتی و فکریاتی تنوع

(۱۹۲۵ع تا ۱۹۷۵ع)

(۲)

از
ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی
ایم. اے؛ پی ایچ. ڈی: ڈی. لٹ. (بمبئی)

حسن اتفاق سے اس دور میں بھی ڈراما نگاروں نے اپنا زیادہ تر زور «طربیہ یکبابی ڈرامے» پر صرف کیا۔ طربیہ ڈراما عام طور پر تیزپائی کا طلبگار ہوتا ہے اور اس میں یہ خوبی واقعات کے انکشاف اور حرکت و عمل میں تندی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ زیر بحث ڈراموں کا ایک بڑا حصہ اس خوبی سے محروم ہے۔ چنانچہ کہیں محض باتوں (مکالمہ) سے «مزاح» پیدا کیا گیا ہے کہیں کرداروں کی ناہمواری سے۔ مکالمے کی بھرمار ایسے ڈراموں کو مزاجاً نثری ڈرامے بناتی ہے کیونکہ حرکات اور اعمال کی شمولیت اور ان کے اظہار کے اسرار و رموز سے سوائے چند ایک ڈراما نگاروں کے اور کوئی سرے سے واقف نہیں۔ اس کے لئے «اسٹیج» کی مضمرات کا شعور و ادراک نہایت ضروری ہے اور ہمارے یہاں کے ننانوے فیصدی ڈراما نگار اس سے قطعاً محروم ہیں بہر حال یہ مزاحیہ ڈرامے مخصوص نوعیتوں کے مالک ہیں خانگی معاملات کے روز مرہ کے لطیف واقعات کو ہلکے پھلکے تصادمات سے منسلک کردیا گیا ہے۔ کہیں ایسے واقعات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جنہیں غیر اہم سمجھ کر عام شخص زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ عشق و محبت، شادی بیاہ، گھریلو کام کاج، مزاج، افتاد طبع، اخلاق و عادات، پسندیدگی وغیرہ کے اختلافات، نظریاتی اختلافات وغیرہ کی مدد سے کچھ مزاحیہ یک بابی ڈرامے لکھے گئے ہیں یہاں اس سے غرض نہیں کہ وہ فنی ضروریات کا کہاں تک احترام کرتے ہیں۔ یہاں ان پر بحث صرف تصوراتی اور فکریاتی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے:

(ا) شوہر کو اس بات پر ناز ہے کہ وہ گلفام ثانی ہے اور کہ ہر صورت اس پر فریفتہ ہے معاملہ بالکل الٹ ہے۔ شوہر نہ صرف بدشکل ہے بلکہ ایسی عورت کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہے جس نے چار سال سے اپنی شکل دکھائے بغیر پاگل سا رکھا ہے آج ان کے دل کی «پھانس» نکلتی ہے۔ ان کی محبوبہ ان کی بیگم صاحبہ ہی ہیں۔

(ب) مہمان صاحب تشریف لائے ہیں اور جب ان سے پورے خاندان بلکہ پالتو جانوروں تک حال چال پوچھا جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ سب «خیریت» ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک عزیز اور پالتو جانور اللہ کو پیارا ہوچکا ہے۔

(ج) ایک صاحب کو «گوہر مراد» یعنی اپنی محبوبہ کو پانے میں صرف اسلئے دقت ہورہی ہے کہ وہ احساس کمتری میں گرفتار ہیں اور وہ صرف اسلئے کہ نہ ان کے پاس دولت ہے نہ سر چھپانے کے لئے مکان کی چھت۔

(د) ایک نوجوان لڑکی کی نظروں میں دو نوجوان لڑکے ہیں جن میں سے ایک تو اس کا شوہر ضرور بن سکتا ہے مگر دونوں لڑکے نہایت حساس واقع ہوئے ہیں۔ ایک اس کی دولت سے گھبراتا ہے اور دوسرا اس کی دولت پر ہی مرتا ہے۔ معاملہ سلجھتا نہیں اب وہ صاحبزادی انکو «بزدل نوجوان» نہ کہے تو کیا کہے۔

(ہ) «اتوار» کا دن عموماً تعطیل کا دن ہوتا ہے۔ میاں ہفتے بھر کی تھکن دور کرنا چاہتے ہیں جبکہ بیگم صاحبہ انہیں بار برداری کا جانور بنانا چاہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ میاں سامان کی فہرست لے کر بازار جائیں۔ دونوں میں خوب جھگڑا ہوتا ہے۔

بعض یک بابی ڈراموں میں مضمرات فن کا پورا احترام کیا گیا ہے۔ یہاں نیز بائی بھی ہے واقعات کا تسلسل بھی حرکت و عمل کی بھرپور گنجائش ہے اور مکالمے میں اعتدال بھی۔ ان میں سے اکثر ڈرامے نہایت خوش اسلوبی سے اسٹیج

بھی کئے جاسکتے ہیں ۔ ان ڈراموں کے « تصادماتی نکات » جانے پہچانے ہیں اور ان میں غـــرابت اور اجنبیت کا عنصر بہت کم ہے ۔ ایسے موضوعات پر پُر اثر ڈرامے تعمیر کرنا آسان کام نہ تھا مگر یہ واقعہ ہے کہ متعلقہ ڈراما نگاروں نے اپنی ان تخلیقات میں اپنے شعور و ادراک اور فن ڈراما نویسی و درک ڈراما شناسی کا پورا مظاہرہ کیا ہے :

(ا) ایک خاتون اس لئے مورد لعن و طعن ہیں کہ وہ زائیدگی کی صلاحیت سے محروم ہیں وہ خود چاہتی ہیں کہ ان کے شـــوہر دوسری شادی فرمالیں۔ ایک بیگم صـاحبہ نظر میں ہیں مگر وہ ان حضرت کو گھـاس نہیں ڈالتیں چنانچہ انہیں « خـــواہ مخـــواہ » پریشان کرنے کا پروگرام بنتا ہے اور یہ خواہ مخواہ اس لئے کہ اب وہ خاتون واقعی امید سے ہیں ۔

(ب) ایک صاحب کا ذوق جمال ، شـوق اداکاری اور درک ہدایت کاری اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ گھر کے ہر فـــرد کو بولنے ، ہنسنے ، رونے کی ہـدایت فرماتے ہیں ۔ غم کے موقع پر گانے کی تلقین کرتے ہیں آپ ہیں : « ڈائریکٹر جھبی رام چھابا »

(ج) آج کی تعلیمی ترویج کے طفیل اور بدلتی ہوئی قدروں کے طوفان میں ایک ایسا طفل مکتب « چھوٹے میاں » پیدا کیا گیا ہے جو وھسکی سے شـوق فرماتا ہے ۔ فلسفہ اور سائنس کی کتابیں چاٹ چکا ہے ۔ اپنی صحت کے بارے میں خوب محتاط ہے اور بڑے میاں کے کان کاٹ ڈالتا ہے ۔

(د) ایک صاحبزادے اظہار عشق کرنا چاہتے ہیں ۔ « ٹیلی فون » سے کام نہیں بنتا بالمشافہ بات کرنا مشکل ہے ۔ صاحبزادی سب کچھ سمجھتی ہوئی بھی کچھ نہیں سمجھتی ۔

(ہ) اخبار کے مالک کو اپنی آمدنی اور خریداروں کی فکر ہے ۔ عملے میں تخفیف کردی ہے ۔ رپورٹروں سے خبر کا مطالبہ ایسے کرتا ہے کہ قتل کے جرم کے وقوع سے پہلے خبر اس کے اخبار میں شائع ہو جائے ۔ ایک زخمی رپورٹر « بارہ بج کر پانچ

منٹ» پر اسمگلروں کی خبر اسے پہنچاتا ہے۔

(و) توہم پرستی اور مخصوص دنوں کو خاص کاموں سے منسلک کرنے کا عارضہ ہمارے ہاں عام ہے۔ «بدھ کام شدھ» میں بھی ندرت طنز و مزاح کا نشانہ بنتی ہے

(ز) اخبار نویس کی مصروفیات بے پناہ ہوتی ہیں اسے اپنے کام سے فرصت نہیں ملتی لیکن جب «اخبار کا دفتر» نا اہلوں کا پلیٹ فارم بن جائے اور لوگ اسے خواہ مخواہ ادیب، شاعر وغیرہ بنانے کے لئے مجبور کریں تو وہ کیا کرے ؟

(ح) کسی کی سادہ لوحی اور خوش اخلاقی سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا ایک شیطان ہوسکتا ہے یا مکاروں کا خاص «گروجی»

(ط) ضروری نہیں کہ ٹیلی فون پر «ہیلو» کہکر معاشقہ کرنے والی خاتون حقیقت بیانی سے کام لے رہی ہو وہ بے وقوف بھی بناسکتی ہے۔

لہذا ایسے مزاحیہ ڈرامے بھی لکھے گئے جو تصوراتی زاویے سے بلند نہیں بلکہ اپنی سرشت اور مخصوص کیفیت کی وجہ سے «کومک» اور «فارس» کے زیادہ قریب ہیں ان ڈراموں میں تفنن کی ترجمانی تفنن کی غرض سے کی گئی ہے۔ ویسے ان کی سب سے بڑی خوبی واقعات اور حرکات و اعمال کی تیز رفتاری ہے۔ اسی وجہ سے یہ ڈرامے دوسرے مزاحیہ ڈراموں کے مقابلے میں اسٹیج پر کوئی سبقت لے جانے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں :

(ا) دو ناکارہ دوست گھر کا کام کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں اور باہر کا کام بیگم صاحبہ کو سونپ دیا جاتا ہے۔ انہیں موسیقی اور ورزش سے فرصت نہیں گھڑی خراب کرتے ہیں، برتن اور کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہیں۔ یہ تو ہے «انتہائے ابتداء» باقی کام بیگم صاحبہ آکر کریں گی۔

(ب) ایک قلی پر شبہ ہے کہ اس نے «ہیرے کی انگوٹھی» چراکر نگل لی ہے۔

اس کے پیٹ کے آپریشن کا منصوبہ بنتا ہے قلی کھانستا ہے اور انگوٹھی باہر آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا ہیرا نقلی تھا۔

(ج) ایک عاشق مزاج ایڈیٹر ایک شاعرہ کو اپنے ہاں دعوت دیتا ہے آزادی کی خاطر اپنی بیوی کو میکے بھیج دیتا ہے شاعرہ برقع میں آتی ہے اور ساتھ ہی بیگم صاحبہ ہوں۔ برقعے میں انکا دوست ہے اس «مڈ بھیڑ» پر جھگڑا شروع ہوتا ہے کہ شاعرہ وارد ہوتی ہے مگر ظاہر ہے کہ اب اس کے لئے ایڈیٹر کے اسٹاف میں کوئی جگہ نہیں۔

(د) ایک حسین عورت پر ملک الموت فریفتہ ہوجاتا ہے اور اس سے شادی کرلیتا ہے مگر بعد میں اسے احساس ہوتا ہے کہ عورت کے ساتھ مرد ہی گزارا کرسکتا ہے لہذا وہ اسے چھوڑکر بھاگ نکلتا ہے اب اس عورت کے لڑکے کی محبوبہ مرض الموت میں مبتلا ہے اور ملک الموت اسکی روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے اور جونہی اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکے اپنے لڑکے کی محبوبہ ہے اور کہ لڑکا اپنی ماں کو بلانے گیا ہے وہ لڑکی کو ہاتھ نہیں لگاتا پھر بھاگ نکلتا ہے۔ یہ ہے انجام «ملک الموت کی شادی» کا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس دور کے ڈراما نگاروں نے ایسے موضوعات کو اہمیت نہیں دی جن پر «المیہ» یا «المطربیہ» ڈرامے تعمیر کئے جاسکتے۔ بعض لوگ تو «المطربیہ» کے حقیقی جادو سے ہی واقف نہیں وہ «الم» اور «طـــرب» کے مرکب کے بھی قائل نہیں کیونکہ انکے دماغوں میں «بوطیقا» کے اصول جاگزیں ہیں حالانکہ اسی بوطیقا کے مقلدین نے یورپ میں بالعموم اور انگریزی ادب میں بالخصوص «المطربیہ» کو ایک قابل رشک مقام پہ دیا ہے۔ بہرکیف ایک دو اردو یک بابی ڈرامے ایسے ضرور لکھے گئے ہیں جو شعوراً یا غیر شعوراً «المطربیہ» کے بتور حاصل کرگئے ہیں۔

(ا) نواب صاحب مالی مشکلات میں مبتلا ہیں البتہ اپنی «پہاڑی مینا» اور پسندیدہ طوائف سے لگاؤ میں کوئی کمی نہیں آتی آخر میں طوائف کی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے اپنی مینا کو ذبح کر ڈالتے ہیں۔

(ب) ایک اچھا شخص عشق کرسکتا ہے یا نہیں؟ وہ خودکشی کرلیتا ہے۔ کیوں؟ ضمیر کی آواز اور قانون سے بچنے کے لئے یا عشق میں؟ یہ عقدہ نہیں کھلتا البتہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ عموماً «نفرت» کے قابل انسان تھا۔

(ج) «تالاب» کے کنارے ایک نوجوان لڑکی خودکشی کے ارادے سے آتی ہے وہاں ایک مجہول سا شخص بھی موجود ہے اور وہ بھی خودکشی کرنا چاہتا ہے آخر میں دونوں اپنا ارادہ بدل کر ایک دوسرے کے درد کا مداوا بننے کیلئے تیار ہوجاتے ہیں۔

(د) ایک شخص کی کار سے ایک لڑکا کچلا جاتا ہے۔ ڈرائیور اس لڑکے کے بدلے میں اس عورت کو اپنا بچہ دے دیتا ہے اور خط و کتابت کے ذریعے یقین دلاتا ہے کہ اسکے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوا ہے بعد میں اس کا لڑکا اپنی اصلی ماں کے پاس جانے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتا اور وہ یوں «ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں» بنتا ہے۔

اردو یک بابی «المیہ» ڈرامے کا یہ المیہ ہے کہ اردو کے بہت کم فنکاروں نے اسکے ساتھ صحیح انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ المیہ ڈرامے کے لئے جس تداخلی نظر اور فنی مشاقی کی ضرورت ہے وہ بہت کم ڈراما نگاروں کی قسمت میں آتی ہے پھر اسٹیج کے نقطۂ نگاہ سے بھی اسے اس رواروی سے پیش نہیں کیا جاسکتا جو عام طور پر «طربیہ» کے لئے مختص ہے۔ ویسے عام معاشرتی عوامل بھی اسے پنپنے نہ دے سکے۔ زندگی کی الجھنوں، عام خانگی ریشہ دوانیوں، دماغی پریشانیوں کی یلغار میں ایک عام ناظر یا قاری اس جرأت اور ہمت سے محروم ہے جو ایک المیہ ڈراما لکھنے، دیکھنے یا دکھانے کے لئے بہت ضروری ہے۔ یوں بھی المیہ ڈراما صرف حزن و ملال کی داستان نہیں ہوتا اس سے «تنقید معاشرت» بلکہ «تنقید حیات» کا کام بھی لیا جاتا ہے اور تنقید کو فوری طور پر قبول کرنے کے لئے ناظرین میں بھی بلوغیت نظر کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ہر حالت میں فقدان ہے۔ تاہم چند ایسے اردو یک بابی ڈراموں کی نشاندھی کی جاسکتی ہے جو «المیہ» کی تعریف کا جزوی احترام کرتے

ہیں :

(ا) نواب صاحب کی «حویلی» گروی ہے ۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی ایک معمر نواب سے کرنے کے لئے تیار ہیں کہ انہوں نے اتنی رقم دے دی ہے جس سے وہ اپنی حویلی واپس لے سکیں مگر لڑکی وہ رقم جلا دیتی ہے۔ حویلی نیلام ہوتی ہے ۔ نواب صاحب زہر کھاکر مر جاتے ہیں ۔

(ب) ایک نوجوان دن رات محنت کرتا ہے تاکہ دو ہزار روپے جمع کرکے وہ اپنی شادی کرے ۔ رقم تو جمع نہیں ہوتی وہ بیچارہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجاتا ہے اور اس کی شادی کا «سودا» طے نہیں ہوتا ۔

(ج) ایک بیوہ عورت اور اسکی تین لڑکیاں — «تین بہنیں» — بڑی تنگی ترشی سے گزارہ کرتی ہیں مگر ان سے بدتر حالت تو اس شرنارتھی خاندان کی ہے جو انکے پڑوس میں آباد ہوا ہے ۔ ماں اور لڑکیاں اپنا کل اثاثہ اس مہاجر خاندان کو دے دیتی ہیں ۔

(د) ایک گورکن اور غسال کی بھی کیا زندگی ہے ۔ لوگ مرتے ہیں تو ان کی زندگی میں ہلکی سی رونق آتی ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی آسامی اسے ایک انگوٹھی دے تو اسے پہننے کے لئے گھر میں عورت تو ہونا چاہیئے اور اس بنیاد پر ڈراما «وہ لوگ» وجود میں آتا ہے ۔

مذکورۂ بالا ڈراموں میں خوش قسمتی سے نہ غیر معمولی جذباتیت ہے اور نہ میلو ڈرامائی کیفیت ۔ دل گدازی کے سامان ضرور موجود ہیں اور وہ کسی نہ کسی معاشرتی مسئلے کے محور پر گردش کرتے ہیں ۔

اس دور میں اردو یک بابی ڈرامے کی تحریری اور ادبی خدمت تو خوب کی گئی ہے تاہم اس کی ساخت اور ہیئت کے حدود کا تعین واضح طور پر نہیں کیا گیا ہے یک منظری یک بابی ڈرامے اور مرکب منظری یک بابی ڈرامے تو خیر پہچانے جاسکتے ہیں مگر ایسے «مختصر ڈرامے» بھی لکھے گئے ہیں جو کئی

کئی ایسے مناظر پر مشتمل ہیں جو لا تعداد علات وقوع پر نمودار ہوتے ہیں اور انہیں یک بابی ڈرامے میں بدلنا کارے دارد کے مترادف ہے ویسے ڈراما نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے واقعات کے منطقی تسلسل سے پلاٹ کی تعمیر میں کافی ریاضت سے کام لیا ہے بعض ڈراموں میں «پلاٹ» صرف «افسانہ» بن کے رہ گیا ہے جو بذات خود ایک عیب ہے «تصادم» کی افزائش بلکہ ایک اچھے تصادماتی نقطے پر ڈرامے کی تعمیر کی صورت بنانے کی روایت بھی پیدا ہوگئی ہے. «خارجی تصادم» عموماً مزاحیہ ڈراموں میں نظر آتا ہے مگر ایسی بلند سطح کے ڈرامے بھی ملتے ہیں جہاں «باطنی تصادم» کا اہتمام کیا گیا ہے اور ایک مخصوص ڈرامائی فضا قائم کی گئی ہے ایسے ڈراموں میں فکریات کا خاص عمل دخل ہے اور ان میں کسی ٹھوس اور خیال انگیز بنیادی مسئلے پر استوار کیا گیا ہے. مکالمہ نگاری کی جانب بھی خاص توجہ دی گئی ہے. خطیبانہ رنگ بالکل ختم ہوچکا ہے اور ہر کردار کے حسب حال مکالمہ تحریر کرنے کی روایت قائم ہوتی ہے. ایسا ہرگز نہیں کہ «مکالمے» کے نام پر ڈرامے نہیں لکھے گئے ہیں تاہم ان کی تعداد نسبتاً کم ہے اور یہ سب ڈرامے «نثری ڈرامے» ہیں. ٹیبلیو، مائم اور پینٹو مائم کی بگڑی ہوئی صورت کے «فیچر» بھی ملتے ہیں تاثراتی نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ بہت عمدہ یک بابی ڈرامے لکھے گئے ہیں جن میں فن تمثیل نگاری کے جملہ لوازمات کا بحسن و خوبی احترام کیا گیا ہے. ان میں تینوں وحدتوں کے باہمی ارتباط، کرداروں کے عمل دخل، انکی حرکات و سکنات، مکالمے کی برجستگی خیال کی رفعت، تدبیر گری کی مشاقی اور تصادم کی عظمت وغیرہ نے مل کر «وحدت تاثر» کو بے پناہ تقویت بخشی ہے. یہ عمدہ تمثیلی ڈرامے ہیں اور یکساں طور پر کامیاب ترتیلی ڈرامے بھی. ان ڈراموں میں «پانچواں کتا»، «سات پیسے»، «عورت اور تاش کے پتے»، «کوئی اکیلا نہیں ہے»، «مصور» اور «نقل مکانی» وغیرہ اوپر زیر بحث آگئے ہیں ان کے علاوہ کچھ اور ڈرامے ہیں جن پر ذیل میں روشنی ڈالی جارہی ہے :

(۱)　اپنی بیوی کی وفاداری کا امتحان لینے کے لئے ایک شخص دریا کے اس پار روپوش ہوجاتا ہے اور مشہور ہوگیا ہے کہ وہ نذر دریا ہوگیا آج اس

عورت کو دریا کی طغیانی سے بچانے کے لئے اس کا عاشق اس کے پاس آتا ہے۔ عورت اس سے محو اختلاط نہیں ہونا چاہتی مبادا اسکا شوہر اچانک آجائے مگر مرد کو یقین ہے کہ مردے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے اور جونہی وہ اس عورت کو اپنے سینے سے لگاتا ہے ایک قہقہہ فضا میں گونجتا ہے۔ اب فیصلہ آپ کیجئے کہ «گھاٹ کی ناؤ» وہ آدمی ہے جو دریا میں ڈوب مرا یا وہ عورت جو اسی دریا کے کنارے پر رہتی ہے۔

(ب) ایک مفرور ملزم ایک غار میں پناہ لیتا ہے دنیا والوں سے دور ہے اور عورت سے نفرت کرتا ہے مگر اس «ویرانے میں ایک رات» میں ناگہانی طور پر عورت وارد ہوتی ہے اور اس کے دل کو محبت کے جذبات سے معمور کردیتی ہے اور اب وہ ایک بار پھر انسان نظر آتا ہے۔

(ج) ایک شخص اپنی بیوی سے صرف اسلئے بے تعلق ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے عاشق سے شادی رچا سکے۔ اسکا وعدہ ہے کہ اسکی لڑکی اپنی ماں سے باقاعدگی سے ملتی رہے گی نئی شادی کے بعد وہ عورت ایک لڑکے کی ماں بن جاتی ہے۔ لڑکا اور لڑکی آپس میں بھائی بہن کی طرح مانوس ہیں البتہ لڑکے کو لڑکی کی آزاد خیالی پسند نہیں۔ لڑکی کا باپ مستقل طور پر تعلقات منقطع کرنا چاہتا ہے یوں ایک روایتی تکون بن جاتی ہے ایک طرف دو مرد ہیں، ایک باپ اور دوسرا بیٹا اور دوسری جانب ایک عورت ہے یعنی ماں۔ اسطرح یہ «دو مرد اور ایک ماں» کی تکون بن جاتی ہے۔

(د) عمر اور نسل کے تینوں طبقوں کی ہلکی پھلکی مسرتوں، انکی آرزوؤں اور پژمردگیوں، ان کے تصورات و اعتقادات کو ایک ماحول میں یکجا کیا گیا ہے اور «تین نسلیں ایک دور» کو صرف ایک مخلص اور جانثار کردار مربوط و منضبط کئے ہوئے ہے۔

(ہ) ایک نباض فطرت بے نیاز شاعر ایک جنس زدہ شہوت پرست عورت کی شیفتگی اور فریفتگی کا مفہوم خوب سمجھتا ہے اور ہرگز نہیں چاہتا کہ اس

عورت کی جنسی خواہشوں کے "گوشے" دیکھائے۔

(و) ایک بے کار، عیاش اور قلاش نواب اس وقت اپنی خاندانی نجابت اور ذاتی ناموس کو سپرد "خدا" کرتا ہے جب وہ اپنے نوکر سے دست و گریباں ہوتا ہے اور اس کی بیگم صاحبہ زندگی کی گاڑی دھکیلنے کے لئے ایک نیا شکار پھانس کر لاتی ہیں۔

(ز) گداؤں اور بے نواؤں کے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں اور کچھ رسم و رواج۔ اس "بیچا سنسار" کی ایک رسم یہ بھی ہے کہ ایک نوجوان بھکارن صرف بھیک ہی نہیں مانگتی بلکہ اکثر و بیشتر عصمت فروشی بھی کرتی ہے آخر وہ بھی عیش و آرام کی خواہاں ہوتی ہے اور شاید مستحق بھی

(ح) مذہب و ملت، رنگ و نسل، قوم اور جماعت کی تمیز کو مدنظر رکھتے ہوئے مکانات کرائے پر اٹھانے والے سیٹھ کو زندگی اور موت کی کشمکش "دروازے کھول دو" کا حکم دیتی ہے۔ ہر شخص کو ایک چھت کے نیچے آرام سے زندگی کاٹنے کا موروثی و معاشرتی حق حاصل ہے۔

ان ڈراموں کے علاوہ لاتعداد ایسی تخلیقات ہیں جن کی تصوراتی اور فکری سطح کافی بلند ہے مگر افسوس وہ بحالت موجودہ عمدہ ڈرامے نہیں۔ ان میں ترمیم و تنسیخ کی خاص ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان خامیوں کے ذمہ دار یہ ڈراما نگار نہیں مانے جاسکتے۔ سارا قصور ان نام نہاد نقادوں اور ماہروں کا ہے جن کی کتابی خرافات کو ہم "احکامات آسمانی" سمجھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ ان "نمائندگان فن" کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ آج تک ایسے مخصوص اور موزوں اصول وضع نہیں کئے گئے ہیں جن کی استمداد سے ایک ڈرامے کے محاسن و معائب کی نشاندھی کی جاسکے ہم اکثر و بیشتر انہیں اصولوں کو بروئے کار لاتے ہیں جن پر "داستان"، "ناول" یا "افسانے" کو جانچتے یا آنکتے ہیں۔ اردو کے ہر ڈرامے کی قسمت میں اسٹیج کی زیارت نہیں

لکھی گئی، اشاعت ہی اس کی آخری منزل ہوتی ہے ویسے اگر کوئی سودائی اردو ڈراما لیکر اسٹیج پر پہنچ بھی جاتا ہے تو اردو کے ناقدین باتمکین کو اتنی فرصت کہاں کہ «موقعۂ واردات» پر پہنچ کر اس کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور پھر اس پر تنقید کا «استرائے جراحی» چلائیں چنانچہ وہ ڈرامے کے «مطالعے» پر ہی قناعت فرماتے ہیں اور اس کے بعد بے شک گفتار کے غازی بن جاتے ہیں، ڈرامے کی پیشکش کے اسلوب پر خوب لے دے کرتے ہیں۔ کبھی اس ڈرامے کو «حقیقت پسندی» کے چشمے سے دیکھتے ہیں کبھی «رمزیت» کے اور کبھی «رومانیت» کے۔ کہیں مصنف کے نقطۂ نظر پر غور کرتے ہیں اور کہیں انداز فکر پر۔ کبھی ڈرامے کے ماحول پر خیال آرائی کرتے ہیں اور کبھی اس کے واقعات کے محاسبہ سے فکری یا جذباتی یا جمالیاتی قدروں کی چیر پھاڑ مگر یہ طے ہے کہ ہر جگہ لفظی شعبدہ بازی، شاعرانہ بادہ گوئی اور پُر تمطن مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ تاویل، تعبیر اور تفسیر کے نام پر پیٹ بھر کے جھوٹ بولتے ہیں اور بعض اوقات کسی ڈرامے پر تبصرہ کرتے ہوئے وفور جذبات سے عاجز آکر اور اپنا مبلغ علم جتانے کے لئے ایسی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ خود ڈراما نگار چکر میں آجاتا ہے کہ «یا مظہر العجائب! یہ چنگاری میرے خاکستر میں کہاں سے نکل آئی؟»

اردو کے نامور نقاد اپنی ذہنی آنکھ (بزرگ اسے بصیرت بھی کہتے ہیں!) سے ڈرامے کی عملی شکل دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ کسی ڈرامے میں پلاٹ کی تعمیر کو، اس روئداد میں واقعات و سانحات کی زنجیر کے پیدا کردہ سلسلہ وار الجھاؤ اور پھر اطمینان بخش سلجھاؤ کو، کسی کردار کے ناگہانی ورود اور اچانک اخراج کی منطق کو، اداکاروں میں حرکت و عمل کے منضبط تانے بانے کو، اداکاروں کی اسٹیج پر نظر نواز گــــروہ بندی کو، اسٹیج پر ہونے ہوئے مختلف خطوط پر پر دلپذیر عمل کو «انکشاف» میں تحیر و تذبذب کی حیران کن گنجائشوں کو، موسیقی کے نشیلے اتار چڑھاؤ کو، اسٹیج پر روشنی اور تاریکی کی ممکنہ آنکھ مچولی کو، مکالمے کے لہجے اور اس کی ادائیگی کے زیر و بم میں پوشیدہ ترنم کو «آویزش» اور «تصادم» کی ظاہری یا باطنی صورت کو — غرض کہ ہر اس گوشے کو جس کا تعلق ڈرامے کے مادی پیکر اور ظاہری حسن سے ہے اور جسکی مدد

سے اندرونی تاثر کا نموج جسے فنی اصطلاح میں عمل تطہیر (CATHARSIS) کہا جاتا ہے، رونما ہوتا ہے قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔ ان کو سب سے بڑی فکر ڈراما نگار کے تفکــر، اس کے تعقل، اس کے وجدان، اسکی بصیرت بلکہ اس کی روشن ضمیری کی ہوتی ہے۔ ایک "لال بجھکڑ" بھری کلاس میں میرے ایک فارس (FARCE) ڈرامے میں "سنجیدگی" کے عناصر تلاش کر رہا تھا قصہ مختصر، یہ نقاد آرام کرسی پر دراز ہوکر فلسفیانہ موشگافیوں سے تنقید کا حق ادا کرتے ہوئے محض "بڑھاتے" ہیں ان ناقدوں اور ڈراما نگاروں کی اسی بدعت کے تتبع میں یہ مقالہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں صرف چند ڈراموں کے تصوراتی اور فکری گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ڈراموں کی ایک بڑی تعداد مقالے کی غیر معمولی ضخامت کے پیش نظر زیر بحث نہیں لائی جاسکی جس کا افسوس ہے اس دور کے ڈرامــوں کے مطالعے کے لئے قارئین کرام راقم الحروف کی کتاب اردو یک بابی ڈراما — جلد سوم از صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۵۴۰ ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

اس مقالے میں جن ڈراموں کا ذکر آیا ہے اسکی اشاعتی تفاصیل حسب ذیل ہیں۔

۱) کوچ از قیوم نظر ماہنامہ ہمایوں لاهور - مئی ۱۹۴۶ع ص ۳۸۷ تا ۳۹۳
۲) کانچ کی گولیاں از یوسف ظفر ماہنامہ ہمایوں لاہور جولائی ۱۹۴۷ع ص ۴۴۳ تا ۴۴۹
۳) شکست کے بعد از کرشن چندر پندرہ روزہ آجکل دہلی یکم جون ۱۹۴۴ع (سالنامہ) ص ۴۲ تا ۵۵
۴) خون کی بوندیں از ابراہیم یوسف، مجموعــہ "خونی ہے ہندوستان" انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال ۱۹۴۶ع
۵) نئے قیدی از فیض احمد فیض انصاری ہفتہ وار نظام بمبئی ۱۷ فروری ۱۹۴۷ ع ص ۹، ۱۲، ۱۴

۶) گـــدھہ از بلونت گارگی۔ ماہنامہ ساقی دہلی جنوری ۱۹۴۶ ع (سالنامہ) ص ۲۴۳ تا ۲۴۷

۷) این ہمہ نیست از محمد حسن ماہنامہ ادبی دنیا لاہور ستمبر ۱۹۴۶ ع ص ۵۷ تا ۶۱

۸) سرگزشت اشرف خان از تمکین کاظمی ماہنامہ نگار، بھوپال اگست ۱۹۲۶ ع ص ۱۲ تا ۲۱

۹) ایک ملعون پیغمبر از اختر شیرانی، ماہنامہ بہارستان، لاہور اکتوبر ۱۹۲۶ ع ص ۵۹ تا ۶۶

۱۰) وطن کے لئے از احمد شجاع پاشا، ماہنامہ عالمگیر لاہور ۔ سالنامہ ۱۹۴۰ ع ص ۱۳۵ تا ۱۳۸

۱۱) آنکھ کا نشہ از آغا حشر کاشمیری ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور (سالنامہ) دسمبر ۱۹۲۷ ع ص ۱۷ تا ۲۸

۱۲) گھر کا مالک از سید عابـــد علی، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، ستمبر ۱۹۳۰ ع ص ۶۶۱ تا ۶۶۳

۱۳) انجلی کی شادی از اندرلال داس، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور (ڈراما نمبر) جون، جولائی ۱۹۳۵ع ص ۴۶ تا ۵۰

۱۴) پہلا پیار از آغا حشر کاشمیری، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، (ڈراما نمبر) جون، جولائی ۱۹۳۵ع ص ۵۷ تا ۵۹

۱۵) ہندوستانی زندگی کا ایک پہلو از سکندر علی خان حامی ویرانی ماہنامہ ادبی دنیا لاہور (سالنامہ) ۱۹۳۶ع ص ۷۷ تا ۷۹

۱۶) جذبۂ ایثار از صادق الخیری ماہنامہ ساقی دہلی اگست ۱۹۳۷ع ص ۴۳ تا ۴۷

۱۷) بے جوڑ شادی از آغا بابر بٹالوی، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، ستمبر ۱۹۳۸ ع ص ۴۴ تا ۴۹

۱۸) میکے کی جیل از ساغر نظامی ماہنامہ پیمانہ آگرہ اکتوبر ۱۹۳۱ع ص ۴۰ تا ۴۲

۱۹) شادی کے دن از اوپیندرناتھ اشک، پندرہ روزہ آجکل دہلی یکم نومبر ۱۹۴۳ع ص ۹ تا ۱۴

۲۰) سوتیلی ماں از امتیاز علی تاج ماہنامہ ھمایوں لاہور فروری ۱۹۳۵ع ص ۱۵۷ تا ۱۶۵
۲۱) اس کی ماں از بلونت گارگی، ماہنامہ ھمایوں لاہور مارچ ۱۹۴۶ ع ص ۲۸۴ تا ۲۹۵
۲۲) بہشت ارضی از ابراھیم یوسف ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور اکتوبر ۱۹۳۹ع ص؟
۲۳) المختصر از پیرزادہ رفیع الخالدی، ماہنامہ ھمایوں لاہور مئی ۱۹۴۷ع ص ۳۶۴ تا ۳۷۰
۲۴) شادی کی اونچ نیچ از سید انصار ناصری، ماہنامہ ساقی، دھلی اپریل ۱۹۴۶ع ص ۱۵۴ تا ۱۵۹
۲۵) انتقام از شـــیر محمد اختر ہفت روزہ شـــیرازہ لاھور یکم اگست ۱۹۴۰ ع ص ۱۵۴ تا ۱۵۹
۲۶) چنی از دیویندر ستیارتھی ماہنامہ ادبی دنیا لاہور مئی ۱۹۴۵ ع ص ۴۱ تا ۴۸
۲۷) گولھے والیاں یا ارباب نشاط از ابراھیم یوسف، ہفتہ وار نظام بمبئی، ۶ جون ۱۹۴۶ ع ص ۱۳ تا ۱۷
۲۸) بھڑیا از مظفر احمد ماہنامہ ادبی دنیا لاہور سالنامہ ۱۹۳۷ع ص ۱۳۶ تا ۱۴۴
۲۹) ماہیخت چورے از مولتار مترجمہ حامد علی خاں ماہنامہ ھمایوں لاہور (سالگرہ نمبر) جنوری ۱۹۳۷ع ص ۸۷ تا ۹۲
۳۰) مشق ناز از محمد عمر و نور الٰہی صاحبان ماہنامہ ادبی دنیا لاہور نوروز نمبر ۱۹۳۲ع ص ۷۰ تا ۷۴
۳۱) چپ کی داد از نور الٰہی محمد عمر ماہنامہ ہمایوں لاہور دســـمبر ۱۹۲۸ ع ص ۹۰۲ تا ۹۱۲
۳۲) چوبٹ راجہ از رحمن مذنب، ماہنامہ ہمایوں لاہور اپریل ۱۹۳۸ع ص ۲۸۶ تا ۲۹۳
۳۳) عدالت از رشید احمد صدیقی ماہنامہ ندیم، گیا جولائی ۱۹۴۰ع ص ۲۵ تا ۲۸
۳۴) انہدام فرانس از فضل حق قریشی، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور ۱۹۴۲ ع ص ۳۷ تا ۴۴

٣٥) منکہ ایک ڈنگر ڈاکٹر از انصار ناصری ، ماہنامہ شاہ جہاں ، دہلی فروری ١٩٣٦ع ص ۴ تا ١٠

٣٦) آرام و سکون از امتیاز علی تاج ، ہفتہ وار تہذیب نسواں ، لاہور ٦ جولائی ١٩۴٠ع ص ٦٥٩ تا ٦٦۴

٣٧) آواز از بلونت گارگی ماہنامہ ہمایوں لاہور، نومبر ١٩۴٥ع ص ٥٩٩ تا ٦٠٣

٣٨) خوش فکرے از کالی داس ماہنامہ ہمایوں لاہور نومبر ١٩۴١ع ص ٦٨۴ تا ٦٩٣

٣٩) مگر، گویا ، یعنی از ناظر انصاری ، ہفتہ وار نظام بمبئی ، ١۴ اپریل ١٩۴٧ ع ص ١٧، ١٩، ٢١، ٢٢

۴٠) منگلیک از کرشن چندر ماہنامہ ادبی دنیا لاہور اپریل ١٩٣٨ع ص ۴٦١ تا ۴٦٧

۴١) بیوی سے عشق از محمد صابر وحشی ماہنامہ بیسویں صدی لاہور ستمبر ١٩٣٨ع ص ۴١ تا ۴٣

۴٢) جرعۂ آخریں از ابراہیم یوسف ، ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور جولائی ١٩٣٥ ع ص ٣٩ تا ۴٥

۴٣) بھیڑیں از بلونت گارگی ماہنامہ ہمایوں لاہور جون ١٩۴۴ع ص ٢٥٨ تا ٢٦٠

۴۴) زندگی اک فریب ہے پیارے از حفیظ جاوید ماہنامہ ساقی دہلی مئی ١٩۴١ ع ص ٢١ تا ٣٠

۴٥) پہلا جنتی از فضل حق قریشی ، ماہنامہ ادبی دنیا ، لاہور نومبر ١٩٣٠ ع ص ٨١٩ تا ٨٣٣

۴٦) جان بخش قاتل از تمکین رام پوری ، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور ستمبر ١٩٣٢ ع ص ١٦٦ تا ١٧٢

۴٧) پرواز از اوپیندر ناتھ اشک ، ماہنامہ ادب لطیف ، لاہور (سالنامہ) ١٩۴٧ ع ص ٣١١ تا ٣١٩

۴٨) سرائے کے باہر از کرشن چندر ماہنامہ ایشیا ، پونا ستمبر ١٩۴٣ع ص ٥٣ تا ٦٢

۴٩) ازلی اور ابدی از نریندر ناتھ ، ماہنامہ ادب لطیف ، لاہور جون ١٩۴٥ ع ص ٣ تا ٩

٥٠) جوانی کی بھول از عزیز کاشمیری ، ماہنامہ موج بہار ، لاہور (ڈراما نمبر) جون

۱۹۳۶ع ص ۳۳ تا ۳۶

۵۱) حکومت از ناصر شمسی ماہنامہ ہمایوں لاہور اگست ۱۹۴۲ع ص ۲۲۱ تا ۲۲۸

۵۲) لگن از ناصر شمسی، ماہنامہ ساقی دہلی، اکتوبر ۱۹۴۵ ع ص ۳۵ تا ۴۳

۵۳) رومان از مرزا ادیب ماہنامہ شاہکار لاہور اگست ۱۹۴۷ع ص ۱۷ تا ۲۷

۵۴) سکینہ از میرزا ادیب پندرہ روزہ آجکل دہلی یکم مئی ۱۹۴۷ع ص ۶۳ تا ۶۷

۵۵) آیا از اوپیندر ناتھ اشک، ماہنامہ نقوش۔ لاہور جشن آزادی نمبر، اگست ۱۹۴۸ع ص ۱۹۲ تا ۲۰۱

۵۶) مصور از آغا بابر ماہنامہ ہمایوں لاہور مئی ۱۹۴۹ع ص ۳۲۵ تا ۳۳۰

۵۷) بچہ گاڑی از میرزا ادیب ماہنامہ ادب لطیف لاہور مارچ ۱۹۵۴ع ص ۶۰ تا ۶۹

۵۸) عورت اور تاش کے پتے از انور عنایت اللہ مجلہ شعور کراچی شمارہ نمبر ۲ ۱۹۵۷ع ص ۱۵۳ تا ۱۶۵

۵۹) کوئی اکیلا نہیں از خواجہ احمد عباس ماہنامہ شاعر بمبئی (جمہوریت نمبر) جنوری، فروری ۱۹۶۲ع ص ۶۵ تا ۶۹، ۱۱۳

۶۰) پھول والی از کرشن چندر، ماہنامہ شاعـــر بمبئی (ڈراما نمبر) ستمبر ۱۹۶۴ع ص ۲۲ تا ۳۲

۶۱) وصیت از حکیم احمد شجاع ماہنامہ نقوش لاہور مئی ۱۹۶۷ع ص ۳۹۳ تا ۴۱۰

۶۲) بچہ اور تعویز از تاجور سامری ماہنامہ اجکل دہلی نومبر ۱۹۶۸ع ص ۲۸ تا ۳۲

۶۳) تلچھٹ از راجندر سنگھ بیدی، مجلہ قند مردان، پاکستان ڈراما نمبر ۱۹۶۱ ع ص ۴۷ تا ۸۳

۶۴) ایک روح گلاب کی سی از ابراھیم یوسف ماہنامہ شاعر جلد نمبر ۳۸ شمارہ ۵، ۶، ۷ ۱۹۶۷ع ص ۴۷ تا ۸۳

۶۵) راز داں اپنا از انور عنایت اللہ ماہنامہ شاعـــر بمبئی (افسانہ و ڈراما نمبر) ۱۹۶۸ع ص ۱۳۸ تا ۱۴۲، ۱۴۹

۶۶) پانچواں کتا از مدثر حسین، ماہنامہ شاعـــر بمبئی، اپریل، مئی ۱۹۶۲ ع ص ۴۵ تا ۶۲، ۹۷

۶۷) آخری ہفتہ از رحمان ساجد ماہنامہ شاعر بمبئی جلد نمبر ۳۸ شمارہ ۱۰، ۱۱

١٩٦٧ع ص ٨١ تا ٨٦ ، ٩٧

٦٨) انصاف کہاں ہے ؟ از میرزا ادیب، ماہنامہ ادب لطیف، لاہور ستمبر ١٩٥٦ع
ص ٥٧ تا ٦٦

٦٩) روانگی از ابراہیم یوسف ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر جون ١٩٦٣ع ص ٣١ تا ٣٨

٧٠) ازلی چکر از انور عنایت اللہ ماہنامہ شاعر بمبئی (ڈراما نمبر) ستمبر ١٩٦٣ ع
ص ٨٧ تا ٩٨ و ١٠٦

٧١) صنم کسدے ار ابراہیم یوسف ماہنامہ ادب لطیف لاہو جولائی ١٩٥٥ع
ص ٥٣ تا ٦٣

٧٢) اداس راہی اداس راہیں از ابراہیم یوسف ماہنامہ شاعر بمبئی دسمبر ١٩٦٨ ع
٣٦ تا ٥٥

٧٣) والد صاحب از ابراہیم یوسف ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر جولائی ١٩٦١ع
ص ٢٥ تا ٣٢

٧٤) ازلی راستے ار اوپیندر ناتھ اشک مجموعہ ازلی راستے ص ٢٧ تا ٩٥

٧٥) طوفان کے بعد ار عشرت انصاری ہفتہ وار نظام لاہور یکم نومبر ١٩٤٨ ع
ص ٥ تا ٦ و ٨

٧٦) ڈالر کا راجہ از اقبال احمد صدیقی ماہنامہ کارواں الہ آباد جنوری ١٩٥٣ع
ص ٢٨ تا ٣٤

٧٧) معمار از ابراہیم یوسف ماہنامہ کردار بھوپال جولائی ١٩٥٤ع ص ٤٩ تا ٥٦

٧٨) گردش از ڈاکٹر جاوید اقبال مجلہ سویرا لاہور نمبر ٢٢ ص ٨٧ تا ١٠٠

٧٩) چوری از ست پرکاش سنگر ماہنامہ شاعر، بمبئی جولائی ١٩٥٥ع ص ٤٥
تا ٥١

٨٠) شہنائی اور جنازے از نعیم کوثر ماہنامہ شاعر بمبئی جلد نمبر ٣٠ (سالنامہ)
٢٤٢ تا ٢٤٤

٨١) رکت دان از رونق دکنی سیمابی ماہنامہ شاعر بمبئی (گاندھی جی نمبر) نومبر
دسمبر ١٩٦٩ع ص ١٨٢ تا ١٩١

٨٢) آواز کے سائے از ل م. شاہد ماہنامہ صبح نو، پٹنہ فروری ١٩٥٩ ع

ص ٣٩ تا ٤١

٨٣) سانپ از عصمت چغتائی مجموعہ شے ڈرامے، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
٢٤٣ تا ٢٧٦

٨٤) دو بہنیں از ناکارہ حیدرآبادی، ماہنامہ ماہ نو کراچی، جولائی ١٩٤٩ ع
ص ٢٠ تا ٢٣

٨٥) سات پیسے از حبیب تنویر، ماہنامہ شاہراہ دہلی جون ١٩٥٤ع ص ٣٢ تا ٤١

٨٦) داغ اور دھبے از ابراہیم یوسف، ماہنامہ شاعر، بمبئی دسمبر ١٩٧١ ع
ص ٤٩ تا ٥٦

٨٧) نقل مکانی از راجندر سنگھ بیدی مجموعہ شے ڈرامے انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڑھ ص ١٨٥ تا ٢٣٢

٨٨) قید حیات از اوپندر ناتھ اشک مجلہ سویرا لاہور ص ١٠٧ تا ١٤٢

٨٩) نوری خالہ از ساجدہ سرور، مجلہ گجر، حیدر آباد دکن نمبر ٢ و ٣
ص ١١٣ تا ١٢٦

٩٠) فنکار از میرا ادیب مجموعہ لہو اور قالین ص ؟ ؟

٩١) ایٹم بم سے پہلے ایٹم بم کے بعد از خواجہ احمد عباس ماہنامہ افکار کراچی
دسمبر ١٩٦٣ع ص ٦٤ تا ٧٢ و ٧٨

٩٢) آٹو میٹک گنز از جوگندر پال، ماہنامہ افکار، کراچی جنوری ١٩٦٣ ع
ص ٦٣ تا ٧٢ و ٨٧

٩٣) سالگرہ کا تحفہ از ابراہیم یوسف، ماہنامہ افکار، کراچی (سالنامہ) ١٩٥٤ع
ص ١٧٣ تا ١٧٦

٩٤) ہار جیت از رونق دکنی سیمابی، ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر مئی ١٩٦٦ع
ص ٣٢ تا ٢٩

٩٥) آنکھ کا تارا از احمد حسن دانش ماہنامہ شاعر بمبئی جلد ٣٨ شمارہ ٦ و ٧
١٩٦٧ع ص ٦٣ تا ٦٧

٩٦) کمینہ کہیں کا از ابراہیم یوسف، ہفتہ وار نظام، لاہور ١٦ اگست ١٩٤٨ ع
ص ٥، ٨، ١٨

۹۷) لاشیں از فیاض انصاری ہفتہ وار نظام لاہور ١٦ فروری ۱۹۴۸ع ص ۵ ، ۱۷
۹۸) سفر از ڈاکٹر جاوید اقبال ماہنامہ ماہ نو کراچی اگست ۱۹۴۹ع ص ۷۰ تا ۷۳
۹۹) ہم بھی کیا یاد کریں گے از اکرام حسن ہفتہ وار نظام لاہور ۳۱ جنوری ۱۹۴۹ع ص ۵ ، ۷ ، ۹ ، ۱۰
۱۰۰) ہم واپس گاؤں جائیں گے از قدوس صہبائی ماہنامہ ایشیا بمبئی جون ۱۹۴۹ع ص ۴۹ تا ۵۵
۱۰۱) عادل از محمد اسحاق قلبی ، ہفتہ وار نظام ، لاہور ۲ جنوری ۱۹۴۹ع ص ۸ تا ۹
۱۰۲) عورت از عبد الماجد ، ماہنامہ ہندوستانی ادب ، حیدر آباد دکن مئی ۱۹۴۹ع ص ۳۴ تا ۳۸
۱۰۳) اسٹالن کی موت از محمد سعید بی . اے ؛ بی ٹی ماہنامہ چراغ راہ ، کراچی جون ۱۹۵۳ع ص ۴۱ تا ۴٦
۱۰۴) نیا چہرہ از رضیہ فصیح احمد مجلہ قند مردان پاکستان ڈراما نمبر ١٩٦١ع ص ١٩٦ تا ۲۱۴
۱۰۵) وقت کے کراہتے رنگ از ابراہیم یوسف ماہنامہ شاعر بمبئی سالنامہ ۱۹۷۲ع ص ۲۲۱ تا ۲۳۸ و ۲۴۲
۱۰۷) خلیج از امجد حسین ، مجلہ سویرا ، لاہور شمارہ ۲۴ ص ۱۵۲ تا ١٦١
۱۰۸) سوانگ از علی عباس حسینی مجموعہ « نورتن » دہلی پرنٹنگ ورکس ، دہلی ۱۹۴۳ع
۱۰۹) پھانس از بلونت سنگھ پندرہ روزہ آجکل دہلی سالنامہ ۱۵ اگست ۱۹۴۹ ع ۷٦ تا ۷۹
۱۱۰) خیریت از فضل حق قریشی ماہنامہ ماہ نو کراچی نومبر ۱۹۴۹ع ص ٦١ ، ٦۲
۱۱۱) گوھر مراد از انور عنایت اللہ ماہنامہ کراچی سالگرہ نمبر اپریل ، مئی ۱۹۵۸ع ص ۸۳ تا ۹۴ و ۱۰۱
۱۱۲) بزدل نوجوان از ابراہیم یوسف ، ہفتہ وار نظام ، لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۸ع ص ۵ ، ۸ ، ۱۰ ، ١٦

۱۱۳) انوار از شوکت تھانوی، ماہنامہ فـــروغ اردو، لکھنؤ جـــولائی ۱۹۶۳ ع
ص ۳۱ تا ۵۰
۱۱۴) خیر خواہ از غیاث احمد گدی ماہنامہ ہمایوں لاہور جولائی ۱۹۴۸ ع
ص ۲۹۸ تا ۳۰۱
۱۱۵) ڈائرکٹر چھوی رام چھابا از عمیق حنفی، ماہنامہ صبا حیدر آباد دکن، اپریل
۱۹۶۱ ع ص ۵۹ تا ۶۵
۱۱۶) چھوٹے میاں از اصغر بٹ، مجموعہ نئے ڈرامے، انجمن ترقی اردو (ھـــند)
علی گڑھ ص ۱۱ تا ۴۰
۱۱۷) ٹیلی فون از آغا ناصر ماہنامہ افکار، کراچی سالنامہ جولائی۔ اگست ۱۹۶۰ ع
ص ۲۲۰ تا ۲۲۶
۱۱۸) بارہ بج کر پانچ منٹ از خواجہ احمد عباس، ماہنامہ شاہراہ، دھلی اگست
۱۹۶۰ع ص ۲۳ تا ۲۷
۱۱۹) دھڑ کلم شدھ از آئی۔ ایس۔ جوہر، مجلہ قند مردان، پاکستان ڈراما نمبر
۱۹۶۱ع ص ۱۶۳ تا ۱۷۵
۱۲۰) اخبار کا دفتر از پرکاش پنڈت ماہنامہ شاہراہ دہلی جون ۱۹۵۵ع ص ۲۳ تا ۴۳
۱۲۱) گروحی از احسان الحق مجموعہ دو ڈرامے، مکتبہ شاہراہ دہلی جون ۱۹۶۸ ع
ص ۸۶ تا ۱۰۴
۱۲۲) ھیلو از ڈاکٹر جاوید اقبال ماہنامہ نقوش شمارہ ۱۲ ص ۶۵ تا ۸۵
۱۲۳) ہیرے کی انگوٹھی از مدن موہن کالیہ ہفت روزہ خبردار بمبئی ۴ و ۱۱ دسمبر
۱۹۳۹ع ص ۹ تا ۱۱ و ۱۲ تا ۱۷
۱۲۴) انتہائے ابتـــدا از ابن انشا، ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، جون ۱۹۴۸ ع
ص ۸۱ تا ۹۶
۱۲۵) مڈ بھیڑ از تاجور سامری مجموعہ میں اور تو ادبی مندر لاہور
۱۲۶) ملک الموت کی شادی از عبد البصیر نعیمی ڈیڑھ ماہی شگوفہ حیدرآباد دکن
فروری، مارچ ۱۹۶۹ع ص ۳۷ تا ۴۳
۱۲۷) پہاڑی مینا از انتصار حسین ماہنامہ نقوش لاہور ص ۶۴ تا ۶۹

١٢٨) نفرت از جیلانی بانو ماہنامہ آجکل دہلی نومبر ١٩٦١ع ص ٢٧ تا ٢٣
١٢٩) تالاب از ناصر شمسی مجموعہ « نئے ڈرامے » انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
١٣٠) ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں، از ابراہیم یوسف، ماہنامہ کتاب لکھنؤ اکتوبر نومبر ١٩٧٢ع ص ١٣٠ تا ١٣٨
١٣١) حویلی ار میرزا ادیب ماہنامہ ادب لطیف لاہور جون ١٩٥٥ع ص ٣٦ تا ٦٠
١٣٢) سودا از انور سجاد دو ماہی صحیفہ لاہور دسمبر ١٩٥٩ع و جنوری ١٩٦٠ع ص ٩٧ تا ١١١
١٣٣) تین بہنیں از ابراہیم یوسف ماہنامہ حور لاہور سالگرہ نمبر ١٩٣٩ع ؟ ؟
١٣٤) وہ لوگ از ہاجرہ مسرور ماہنامہ ماہ نو کراچی جنوری ١٩٦٠ع ص ٢١تا٣٢
١٣٥) گھاٹ کی ناؤ از بلونت گارگی ماہنامہ شاہراہ دہلی سالنامہ ١٩٥٦ع ص ١٠٦ تا ١١٣ و ١٣٥
١٣٦) ویرانے میں ایک رات از انور عنایت اللہ ماہنامہ مشرب کراچی نومبر دسمبر ١٩٥٣ع سالنامہ ص ٣٥ تا ٦٢
١٣٧) دو مرد اور ایک ماں از کرتار سنگھ دُگل ماہنامہ آجکل دہلی دسمبر ١٩٥٣ع ٧ تا ١٦
١٣٨) تین نسلیں ایک دور از ابراہیم یوسف ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر نومبر، دسمبر ١٩٦٧ع ص ١٢ تا ٣٢ و ٢٥ تا ٤٠
١٣٩) کوٹلے از سعادت حسن منٹو مجلہ شعور کراچی شمارہ ٦ ص ١ تا ١٤
١٤٠) لحد از ظفر رحیم ماہنامہ افکار کراچی (سالنامہ) ١٩٥٣ع ص ٣٨ تا ٤٣
١٤١) نیچا سنسار از اشعار بیو تنوی، ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ نومبر ١٩٦٣ع ص ٢٨ تا ٥٦
١٤٢) دروازے کھول دو از کرشن چندر، مکتبہ جامعہ، دہلی اکتوبر ١٩٦٧ع ص ٧ تا ٤٧

• • •

Edited by Prof Nizamuddin S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director, Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Published by Mr. Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary, Anjuman-i-Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400008

کتابی دنیا

دکن میں اردو مصنفہ ڈاکٹر امجد علی

تبصرہ از

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جنوبی ہند میں بولی جانے والی رابطہ کی زبان "دکھنی" ہندی یا ہندوی کی ایک شکل ہے جو بالخصوص آندھرا مہاراشٹرہ، میسور اور مدراس کے اکثر و بیشتر علاقوں میں بولی جاتی ہے اور چودھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک بہمنی دور حکومت میں یہ عوامی زبان، ادبی اور درباری زبان کے درجے تک پہنچ گئی۔ ہندوی زبان نواح دہلی کی چند بولیوں میں کھڑی بولی، برج بھاشا، ہریانی اور میواتی کی بنیاد پر تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے ذریعے دکن میں داخل ہوگئی۔ بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد عادل شاہی، قطب شاہی، برید شاہی، احمد شاہی اور نظام شاہی دور حکومت میں فارسی کے ساتھ "دکھنی" کی اشاعت اور ترقی کے لئے نہ صرف اسباب پیدا ہوئے بلکہ اسکی تحفظ اور بقا کی خاطر زبردست مواقع فراہم کئے گئے۔ اہالیان دکن اپنی مادری زبان تیلگو، کنڑ، مرہٹی یا تمل زبان کے ساتھ دکھنی کا بھی استعمال کرتی تھیں اور حکومت وقت اس رابطہ کی زبان یا عوامی زبان کو "دکھنی" کے نام سے یاد کرتی تھی۔

ڈاکٹر امجد علی کی یہ تصنیف "دکن میں اردو" ورنگل (حیدرآباد) سے شائع

ہوئی ہے۔ اس میں صاحب موصوف نے تیلگو زبان کے ساتھ کنڑ، مرہٹی اور تمل زبانوں کے اثرات کی بھی نشاندھی کی ہے اور دکھنی میں جنوبی ہند کی ان چار زبانوں کے الفاظ و محاورات کا ذکر اور قواعد کے تصریف و تحریف کا اظہار اچھے انداز میں کیا ہے۔

موصوف نے زیر تبصرہ کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ (الف) دکن میں اردو (چار دور) (ب) آواز اور اس کا استعمال (صوتیات) (ج) دکھنی اردو اور اسکی خصوصیات (د) دراویدی زبانیں اور ان کے اثرات (ہ) تیلگو کے الفاظ و محاورات (و) دکھنی کلچر (ز) دکھنی گیت، پہیلیاں، دو سخنے (ح) دکھنی کہاوتیں اور محاورے۔

پہلے باب میں دکھنی کی ترقی اور اسکی ترقی کے اسباب کو چار دور میں تقسیم کیا ہے۔ دوسرے باب میں صوتیات کے تعلق سے اچھی بحث کی ہے اور آواز اور اسکے استعمال کے بارے میں لکھا ہے۔ تیسرے اور چوتھے بابوں میں دکھنی اردو کی خصوصیات اور مقامی زبانوں میں مرہٹی، تیلگو، کنڑ اور تمل کے اثرات پر اظہار خیال کیا ہے۔ چھٹے باب میں تیلگو کے اثرات اور دکھنی کلچر کو ہندوستانی کلچر کے نام سے یاد کیا ہے۔ آخر میں دکھنی گیت، پہیلیاں دو سخنے، کہاوتیں، ضرب الامثال اور محاوروں کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر امجد صاحب نے بڑی محنت سے "دکھنی" پر دراویدی زبانوں کے اثرات پر جو تبصرہ کیا ہے اور مواد کے پیش نظر جو تجزیہ کیا ہے۔ وہ قابل تعریف ہے۔

امید ہے کہ زیر تبصرہ کتاب "دکھنی" سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی مددگار ثابت ہوگی۔

● ● ●

شہر آشوب مصنفہ ڈاکٹر محمد سعد اللہ

تبصرہ از

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

شہر آشوب، غزل، قصیدہ اور رباعی کی طرح ایک صنف سخن ہے جو اور اصناف سخن کی طرح فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ اس صنف سخن کی اہمیت ہیئت سے زیادہ اس کے مواد اور موضوع کی وجہ سے ہے۔ فارسی میں اس کا کوئی مستقل موضوع نہیں تھا۔ ہر شاعر نے اپنی ضرورت اور دلچسپی کے حساب سے اپنا ایک موضوع چنا اور اس پر اس صنف سخن کی مدد سے طبع آزمائی کی۔ لیکن اردو میں آکر یہ صنف ایک خاص موضوع سے منسلک ہوگئی اور اس میں ملکوں اور شہروں کے وہ حالات بیان ہونے لگے جو سیاسی، سماجی، اقتصادی یا اخلاقی اعتبار سے پر آشوب تھے۔ اور جنھوں نے معاشرہ کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اردو میں اس صنف شاعری کا ایک بڑا خزانہ موجود ہے جس کی طرف کسی نے آج تک پوری طرح دھیان نہیں دیا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس صنف شاعری پر مستقل طور پر کام کیا جائے چنانچہ ڈاکٹر محمد سعداللہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور شہر آشوب کو اپنے مقالہ کا موضوع بنایا۔ ناگپور یونیورسٹی نے انہیں ان کے اسی مقالہ پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری عطا کی ہے۔

کتاب ایک مقدمہ اور چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے عنوانات ہیں: تعارف صنف، شہر آشوب کا آغاز، فارسی و عربی میں شہر آشوب، اردو میں شہر آشوب اور حرف آخر۔ پہلے تین ابواب شہر آشوب کی تعریف، اس کی وضاحت اور اس کے تاریخی پس منظر سے متعلق ہیں اور آخری دو ابواب میں اردو شہر آشوب کا تفصیلی بیان اور اس کا تنقیدی جائزہ ہے۔ چونکہ مقالہ کا موضوع اردو شہر آشوب ہے اس لئے اس کے بیان میں انھوں نے ذرا تفصیل سے کام لیا ہے۔

چنانچہ چوتھا باب چار ادوار پر منقسم ہے۔ دور اول میں سنہ ۱۷۰۷ سے ۱۸۵۷ تک کی تفصیلات ہیں، دور دوم میں صرف ۱۸۵۷ کے شہر آشوبوں کا ذکر ہے۔ دور سوم میں ۱۸۵۷ سے ۱۹۴۷ تک کے آشوب نگاروں کا تذکرہ ہے اور

دور چہارم میں ۱۹۴۷ سے موجودہ دور تک کے آشوب نگار ہیں۔ ۱۷۰۷ سے ۱۸۵۷ تک کا زمانہ تاریخی اور سیاسی اعتبار سے ایک بڑا پر آشوب زمانہ تھا سنہ ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کے انتقال کی وجہ سے ملکی سیاست میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا، ہر طرف بغاوتیں اور ہر طرف خانہ جنگیاں، سینکڑوں شہر تباہ ہوئے، ہزاروں گھر لٹے، لاکھوں افراد کا خون ہوا ایک عجیب انتشار اور افراتفری کا عالم تھا، ظاہر ہے اس عہد کے شعراء ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور اس کے نتیجے میں اردو شہر آشوبوں کی ایک بڑی تعداد وجود میں آگئی ان سارے شہر آشوبوں کا اس میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ان پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد سعد اللہ کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تعلم میں گذرا ہے، برسوں وہ ایس کے کے کالج جلگاؤں (جامود) میں شعبہ اردو و فارسی کے صدر رہے اور بڑے خلوص اور لگن سے طلبہ کی رہنمائی کی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور ان کی نظر گہری ہے، چنانچہ شہر آشوب پر اپنی اس کتاب میں بھی انہوں نے اپنی تحقیق کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور جو کچھ لکھا ہے پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ لکھا ہے، بلا شبہ یہ کتاب اپنے موضوع کی سب سے اچھی کتاب ہے اور یہ کتاب حلگاؤں (جامود) ضلع بلڈانہ میں شائع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں گے۔

• • •

مقالات

اسلامیات

ارشد مختار

اسلامی عقیدہ کی بنیادیں

(البلاغ بمبئی، نومبر ۱۹۹۱ع، جلد ۲ شمارہ ۴، ص ۱۳ - ۱۶)

اسلامی عقیدہ کی اہمیت اور اس کی بنیادوں کا ذکر قرآن کی روشنی میں۔

البوھی محمد لبیب

مترجم : ندوی فہیم اختر

اسراء و معراج

(البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۲ع، جلد ۲ شمارہ ٦، ص ۱۴ - ۱۸)

دلائل سے ثابت کیا ہے کہ معراج روحانی نہیں جسمانی تھی۔

برہان الدین سنبھلی

کیا قمری مہینوں کے اثبات میں علم ہیئت سے مدد لی جاسکتی ہے

(الفرقان لکھنؤ، جنوری ۱۹۹۲ع، جلد ٦ شمارہ ۱، ص ۱۴ - ۲٦)

اس مضمون میں بتایا ہے کہ علم ہیئت کی مدد سے چاند کی آمد کا حکم ثابت کرنا شرعاً درست نہیں البتہ اس سے رویت ہلال کے دعویٰ کی صحت جانچنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

شبیر احمد

رسول اکرمؐ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے

(البلاغ بمبئی، نومبر ۱۹۹۱ع، جلد ۲
شمارہ ۳، ص ۳۰ - ۳۷)

رسول اکرم نے مختلف جنگوں اور خاص طور پر غزوہ فتح مکہ میں جس حکمت عملی سے کام لیا اسکی تفصیلات.

عبد الرحمن مومن

صحیح بخاری کی روایت زنائے قردة

(معارف اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۹۲ع
جلد ۱۴۹، شمارہ ۳، ص ۱۶۵ - ۱۸۰)

بخاری میں ایک حدیث بندریا کی زناکاری اور دوسرے بندروں کے ہاتھوں اس کی سنگساری کا ذکر ہے۔ اس روایت کو مضمون نگار نے محل نظر قرار دیا ہے اور اسکی وجوہات بیان کی ہیں

عمری محمد عارف

شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی اور انکی
تفسیر قرآن القرآن بالبیان

(معارف اعظم گڈھ، فروری ۱۹۹۲ع
جلد ۱۴۹، شمارہ ۲، ص ۱۲۴ - ۱۴۰)

شاہ کلیم اللہؒ کے حالات زندگی اور انکی تصانیف کا ذکر کرنے کے بعد ان کی سب سے اہم تصنیف قرآن القرآن بالبیان پر روشنی ڈالی ہے۔

قاسمی اخلاق حسین

خصوصیات صحابۂ کرام
قرآن کی روشنی میں

(الفرقان لکھنؤ، دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۵۹
شمارہ ۱۲، ص ۱۷ - ۲۸)

مذکورہ مضمون کی دوسری قسط، اس میں توحید اور رسالت کے معاملہ میں صحابہ اور صحابیات کے پختہ ایمان کو واقعات کی مدد سے ثابت کیا گیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری

ہجرت سے پہلے مدینہ کی درسگاہیں

(معارف اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۹۱ع
جلد ۱۴۸، شمارہ ۵، ص ۳۶۹ - ۳۸۵)

ہجرت سے دو سال قبل ہی مدینہ میں مساجد تعمیر ہونے لگیں اور ان مساجد میں قرآن اور دین کی تعلیم کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس سلسلہ میں مسجد بنی زریق، مسجد قباء، اور مسجد بقیع کی تفصیلات درج ہیں۔

کنور محمد یوسف امین

اسلامی سائنس کی نشأة ثانیہ اور

طب یونانی میں تحقیق

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، فروری ١٩٩٢ع
جلد ١١، شمارہ ٢، ص ١٠ - ١٤)

طب یونانی اور مغربی طب کا موازنہ اور اسکا ذکر کہ تقریباً پچاس سال سے طب یونانی کو جدید سائنس کی روشنی میں ترقی دینے کے لئے کیا کاوشیں ہو رہی ہیں۔

مفتی شعیب اللہ

کیا عذاب قبر کا عقیدہ غیر اسلامی
تصور ہے

(الفرقان لکھنؤ، دسمبر ١٩٩١ع، جلد ٥٩
شمارہ ١٢، ص ٩ - ١٦)

یہ مذکورہ مضمون کی دوسری قسط ہے اور اس میں احادیث اور اجماع اہل سنت و الجماعت کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ عذاب قبر کا منکر گمراہ ہے۔

مفتی شعیب اللہ

احادیث عذاب قبر پر اعتراضات
اور ان کے جواب

(الفرقان لکھنؤ، جنوری ١٩٩٢ع جلد ٦٠
شمارہ ١، ص ٣٧ - ٤٥)

مضمون کی تیسری قسط، ان میں ان چار اعتراضات کے جواب ہیں جو مولف "شمع حقیقت"، قاضی محمد عیسی نے احادیث قبر کے سلسلہ میں کئے تھے۔

ندوی مختار احمد

قرآن معجزۂ الہی ہے

(البلاغ بمبئی، جنوری ١٩٩٢ع، جلد ٢
شمارہ ٦، ص ٨ - ١٠)

آیات و واقعات کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ قرآن ایک معجزۂ الہی ہے۔

نور الحسن راشد

تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسماعیل کے خلاف برپا شورش، تاریخ اور حقیقت
کے آئینہ میں

(الفرقان لکھنؤ، جنوری ١٩٩٢ع جلد ٦٠
شمارہ ١، ص ٢٧ -)

مضمون کی پانچویں قسط، اس میں معاصرین، مخالفین اور اکابر کی نظر میں شاہ اسماعیل کی جو وقعت تھی اس کو واضح کیا ہے۔

ادبیات

اکاپیکیر بونس

مولوی نذیر احمد کا ذہنی سفر
(ناولوں کی روشنی میں)

(نوائے ادب بمبئی ، اکتوبر ۱۹۹۱ ع جلد ۴۱ ، شمارہ ۲ ، ص ۱ - ۱۰)

نذیر احمد بنیادی طور پر ایک معلم اخلاق اور سماجی مصلح تھے ، مگر انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج کی دو خرابیوں کی اصلاح پر زیادہ زور دیا ۔ عورت کی جہالت اور اسکی توہم پرستی - مولویوں کی تنگ نظری اور نفس پرستی ، مقالہ میں ان کی انہیں خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے ۔

ابراہیم یوسف

اردو ڈراما ۱۹۸۴ سے ۱۹۹۰ تک

(کتاب نما دہلی ، فروری ۱۹۹۲ع جلد ۳۲ شمارہ ۲ ، ص ۹ - ۲۷)

۱۹۸۴ سے ۱۹۹۰ تک کے ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زیادہ تر اخلاقی گراوٹ ، افراتفری خوف ، اقتصادی بدحالی ، خود غرضی کرپشن ، ذہنی و علمی تشدد کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ مقالہ میں اسی بحث کی تفصیلات ہیں ۔

اشرف رفیع

یعقوب میراں مجتہدی کی
اردو انگریزی لغت

(اخبار اردو اسلام آباد ، نومبر ۱۹۹۱ع جلد ۸ ، شمارہ ۱۱ ، ص ۲۱ - ۲۳)

اردو انگریزی کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے بعد یعقوب میراں مجتہدی کی اردو انگریزی لغت کا تعارف پیش کیا ہے ۔

امیر زہرا حسین

پیم نیم

(سب رس حیدر آباد ، جنوری ۱۹۹۲ع جلد ۵۵ ، شمارہ ۱ ، ص ۵۱ - ۱۶)

علی عادل شاہ ثانی کی چار ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی کا تعارف جو ایک مخطوطہ کی شکل میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے ۔

انیس ادیب

اردو شاعری میں تخلص کی روایت

(معارف اعظم گڈھ ، نومبر ۱۹۹۱ع ،

جلد ۱۴۸، شمارہ ۱۱، ص ۳۷۵ - ۳۷۹)

یہ بتانے کے بعد کہ تخلص کی روایت فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ تخلص کے معنی، اسکی ضرورت اور اس کے انتخاب پر روشنی ڈالی ہے۔

بدیع الزماں محمد

ادب کی ماہیت

(سب رس حیدر آباد، دسمبر ۱۹۹۱ ع جلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص ۷ - ۱۰)

ادب کی تعریف اور اس کی ماہیت بیان کرنے کے بعد ادب، ادیب اور نظریہ کے باہمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

حادث قریشی

چراغ نیم شب

(شب خون الہ آباد، مئی، جون، جولائی ۱۹۹ ع، جلد ۲۴، شمارہ ۶۲، ص ۴۳ - ۴۳

سلیم احمد کا پہلا مجموعہ کلام ،بیاض، شائع ہوا تو لوگوں نے شور مچایا کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے معاشرہ کو برہنہ کردیا ہے، یہ شور انکی آواز کو دبا نہ سکا انکے دو اور مجموعے سامنے آئے۔ اکائی اور چراغ نیم شب اس میں انہیں کا جائزہ ہے۔

حسن اقبال

تسہیل العروض، اردو عروض کی تشکیل نو کا اولین سلسلہ

(شب خون الہ آباد، مئی، جون، جولائی ۱۹۹۱ع، جلد ۲۴، شمارہ ۱۶۲، ص ۵۷ - ۶۴)

علم العروض کا ایک فنی جائزہ اور آسان بنانے کے طریقے۔

حمایت علی

قمر ساحری - بحیثیت شاعر

(سب رس حیدر آباد، جنوری ۱۹۹۲ ع جلد ۵۵، شمارہ ۱، ص ۱۷ - ۳۸)

قمر ساحری حیدر آباد کے ایک کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں، ان کے دو مجموعے زلزلے اور ضرب آتشیں شائع ہوچکے ہیں اور شاخ تازہ زیر طبع ہے اس میں انکی شاعری کا ایک تفصیلی جائزہ ہے۔

دیوندر اسر اور انیس الرحمن

گوشۂ ناڈین گارڈیمر

(آجکل دہلی، جنوری ۱۹۹۲ع، جلد ۵۰ شمارہ ٦، ص ۳۰ - ۳۸)

ناڈین گارڈیمر جنوبی افریقہ کی ایک مشہور ادیبہ ہیں، انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں انسانی وابستگی کو پوری صداقت سے پیش کیا ہے۔ ان کی ان عظیم تخلیقات پر ۱۹۹۱ع میں انہیں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔

رستوگی تارا چرن

غالب کی بعض تصنیفات کے بارے میں تحزیاتی مطالعہ

(بزم شکروش بمبئی، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۱ع حلد ۳، شمارہ ۸، ص ۲۱ - ۲۴)

اس مضمون میں کالی داس گپتا رضا کی ایک تصنیف "غالب کی بعض تصنیفات کے بارے میں" کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

رشید حسن خان

ہندوستانی فارسی میں تلفظ و املا کے بعض مسائل

(شاعر بمبئی، جلد ٦۲، شمارہ ۹ ص ۸ - ۱۳)

ہندوستانی فارسی میں یائے مجہول اور واو مجہول، نون غنہ، یائے ماقبل مفتوح کے تلفظ و املا میں اکثر تسامح ہوا ہے اس مضمون میں اسی کی نشاندھی کی گئی ہے۔

رفعت اختر

نواب الہی بخش معروف کی شاعری

(سب رس حیدر آباد، دسمبر ۱۹۹۱ع حلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص ۱۵ - ۱۸)

معروف کی شاعری کا مختصر تعارف ہے۔

زیب حیدر

فارسی غزل میں عرفی کی شاعرانہ عظمت و انفرادیت

(سب رس حیدر آباد، دسمبر ۱۹۹۱ع حلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص ۱۱ - ۱۴)

فارسی غزلیات میں عرفی کی عظمت و انفرادیت اور جدت کا جائزہ۔

ساحر شیوی

کالی داس گپتا رضا کے برجستہ اشعار

(بوم فکر و فن ، اکتوبر - دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۳ ، شمارہ ۸ ، ص ۸۳ - ۸۶)

رضا کے بعض برجستہ اشعار کا تذکرہ ان کے پس منظر کے ساتھ ۔

شاہد خواجہ حمید الدین

اردو پر فرانسیسی زبان کے اثرات

(سب رس حیدر آباد ، دسمبر ۱۹۹۱ ع جلد ۵۴ ، شمارہ ۱۲ ، ص ۳ - ۶)

اردو پر فرانسیسی زبان کے اثرات کو ان حالات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ۱۷۰۱ع کے بعد جنوبی ھند میں فرانسیسیوں کی آمد اور مقامی لوگوں سے ان کے سیاسی ، معاشی اور فوجی تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے ۔

صدیقی فصیح احمد

اردو یک بابی ڈراموں میں موضوعاتی و فکریاتی تنوع

(سوائے ادب بمبئی ، اکتوبر ۱۹۹۱ع ، جلد ۴۱ ، شمارہ ۲ ، ص ۳۶ - ۷۵)

۱۹۲۳ سے پہلے بھی اردو میں یکبابی ڈرامے موجود تھے ، مگر صحیح معنوں میں یک بابی ڈراموں کا آغاز اسی سنہ سے ہوا ۔ اس مقالہ میں ۱۹۴۵ع سے ۱۹۷۵ع کے اردو یک بابی ڈراموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان ڈراموں میں موضوعاتی و فکریاتی تنوع کس قدر ہے ۔

صدیقی افتخار امام

گوشۂ عصمت چغتائی

(شاعر بمبئی ، جلد ۶۲ ، شمارہ ۸ ص ۱۱ - ۳۰)

اس گوشہ میں حسب ذیل مضامین ہیں :

۱- ندا فاضلی : عصمت آپا

۲- افتخار امام صدیقی : میرے الفاظ واپس دیدو

عبد المغنی

روش صدیقی کی غزل گوئی

(کتاب نما دہلی ، فروری ۱۹۹۲ ع ، جلد ۳۲ ، شمارہ ۲ ، ص ۲۷ - ۳۶)

روش صدیقی کی غزلوں کی ادبی و شعری خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔

عقیل ہاشمی

حسان دکن ، خواجہ عبد العلی صدیقی

(سب رس حیدرآباد، ستمبر ۱۹۹۱ع
جلد ۵۴، شمارہ ۹، ص ۴ - ۸)

صدیقی کی شاعری کا تعارف، صدیقی حیدرآباد کے تھے، اور انہوں نے حمد نعت اور منقبت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اسی لئے وہ حسانِ دکن کہلائے۔

فاروقی شمس الرحمٰن

تذکیر و تانیث کے بارے میں

(شب خون الہ آباد، مئی، جولائی ۱۹۹۱ع
جلد ۲۴، شمارہ ۱۶۲، ص ۲۵ - ۲۸)

"اردو میں تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر نہیں ہوسکتے، اسکا انحصار بولنے والوں کی ترجیح پر ہوتا ہے، اہل زبان کا ہوا کھڑا کرنا انصاف اور اصول دونوں کے منافی ہے" آج کے اس لسانی نظریہ پر مثالوں کی مدد سے بحث کی ہے۔

قرۃ العین حیدر اور اشک

گوشۂ عصمت چغتائی

(آجکل دہلی، جنوری ۱۹۹۲ع، جلد ۵۰
شمارہ ٦، ص ۳ - ۳٦)

اس میں عصمت چغتائی پر درج ذیل

پانچ مضامین ہیں:

(۱) لیڈی چنگیز خان، قرۃ العین حیدر
(۲) دوزخی کی باتیں، اوپیندر ناتھ اشک
(۳) روشن خیال خاتون، محمد حسن
(۴) سماج کی محتسب، شمس کنول
(۵) عصمت کی معنویت، شمیم حنفی

قرۃ العین طاہرہ

جدید غزل رد و قبولیت کے دوراہے پر

(بزم فکر و فن بمبئی، اکتوبر - دسمبر
۱۹۹۱ع، جلد ۳، شمارہ ۸، ص ۴۳-۴۸)

وقتاً فوقتاً اردو غزل پر جو اعتراض ہوئے انکا جائزہ اور ان اعتراضات کے جوابات۔

گربچن چندن

سدا سکھ لعل، اردو صحافت کا
پہلا اڈیٹر

(کتاب نما دہلی، فروری ۱۹۹۲ع، جلد ۳۲، شمارہ ۲، ص ۴۷)

جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار تھا اور سدا سکھ لعل اس کے اڈیٹر تھے اس میں دونوں کا تعارف ہے۔

لد میلا داسی لیوا

سوویت روس میں اردو

(ہماری زبان، ۱۵ نومبر ۱۹۹۱ع، جلد ۵۰، شمارہ ۴۱، ص ۸)

سوویت روس میں کہاں کہاں اردو پڑھائی جاتی ہے اسکی تفصیل۔

مظہر سلیم

بمبئی کے ہم عصر افسانہ نگار
ایک ناتمام جائزہ

(بزم فکروفن بمبئی، اکتوبر- دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۳، شمارہ ۷، ص ۱۰۳ - ۱۰۷)

سریندر پرکاش، ساگر سرحدی، سلام بن رزاق، انور قمر، ساجد رشید مقصود حمید، م ناگ، اقبال نیازی اسلم خان، عبدالعزیز خان کے افسانوں کا جائزہ

نارنگ گوپی چند

بھارت نے کیا کہا

(شب خون الہ آباد، مئی، جون، جولائی ۱۹۹۱ع، جلد ۲۴، شمارہ ۱۶۲، ص ۳ - ۶)

صریر کراچی کے مدیر فہیم اعظمی کے استفسار پر گوپی چند نارنگ نے بھارت کے دو اقوال پر اظہار خیال کیا ہے جو یہاں درج ہے۔

ندوی احتشام احمد

تحریک عصبۂ اندلسیہ کا ارتقا

(معارف اعظم گڈھ، دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۱۴۸، شمارہ ۱۲، ص ۴۱۶-۴۳۶)

تحریک اندلسیہ ان عرب شاعروں اور ادیبوں کی چلائی ہوئی ایک تحریک تھی جو شام و لبنان سے ہجرت کرکے جنوبی امریکہ میں جابسے تھے، اس مضمون میں اس عربی تحریک کی تفصیلات ہیں۔

نظامی خلیق احمد

عہد غالب کا فکری اور تہذیبی ماحول

(معارف اعظم گڈھ، فروری ۱۹۹۲ع جلد ۱۴۹، شمارہ ۲، ص ۸۵ - ۱۰۶)

تاریخ کی روشنی میں بتایا ہے کہ غالب کے عہد کا ادبی، فکری و تہذیبی ماحول کیا تھا۔

وحید اشرف سید

خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری
میں سلوک

(معارف اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۹۱ع جلد

۱۴۸، شمارہ ۱۱، ص ۳۲۵ - ۳۴۳)

مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ حافظ کے کلام میں معرفت و سلوک کی باتیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

یحییٰ نشیط سید

اردو نعت گوئی کے موضوعات

(معارف اعظم گڈھ، فروری ۱۹۹۲ع جلد ۱۴۹، شمارہ ۲، ص ۱۰۷ - ۱۲۳)

یہ مضمون کی پہلی قسط ہے اس میں نعت کی وضاحت کے بعد نعت خالص اور میلاد ناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

شخصیات

آرزو مختار الدین

ڈاکٹر ذکی الدین
علی گڑھ کا ایک ممتاز سائنس داں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۱۰، شمارہ ۱۲، ص ۱۲ - ۱۷)

ذکی الدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ہونہار طالب علم تھے۔ ۱۹۳۳ میں انہوں نے طبیعیات میں پی ایچ ڈی کی اور پھر اسکالرشپ پر جرمنی چلے گئے واپس آکر یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے ۴۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ انہیں کا تعارف اس میں پیش کیا گیا ہے۔

آزاد محمد اسمعیل

مولانا حسرت موہانی کا سنہ پیدائش
ایک جدید انکشاف

(ہماری زبان دہلی، ۸ دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۵۰، شمارہ ۴۴، ص ۱ - ۲)

حسرت کے سنہ پیدائش کے سلسلہ میں اب تک مختلف سوانح نگاروں نے جو باتیں کہی ہیں وہ سب محض قیاس پر مبنی ہیں۔ ان کا صحیح سنہ پیدائش انکی اسکول کے ریکارڈ میں درج ہے اور وہ ہے ۱۸۸۴ع۔

اصلاحی ابو سعد

مولانا حمید الدین فراہی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جنوری ۱۹۹۲ع جلد ۱۱، شمارہ ۱، ص ۳۱ - ۳۷)

حمید الدین فراہی کے حالات زندگی اور انکی تصانیف کا تذکرہ۔

اصلاحی ابو سفیان

جمال الدین افغانی اور العروۃ الوثقیٰ

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ ، جنوری ۱۹۹۲ع
جلد ۱۱ ، شمارہ ۱ ، ص ۲۱)

جمال الدین افغانی کے حالات زندگی اور انکے پندرہ روز رسالۃ العروۃ الوثقیٰ کا تعارف جو وہ پیرس سے شائع کرتے تھے ۔

اصلاحی ضیا الدین

مولانا فراہی سیمینار

(معارف اعظم گڈھ ، نومبر ۱۹۹۱ع
جلد ۱۴۸ ، شمارہ ۱۱ ، ص ۳۸۰ - ۳۸۳)

مدرسۃ الاصلاح ، سرائے میر ، اعظم گڈھ میں اسکے طلبائے قدیم کی انجمن کی طرف سے ۸ - ۹ - ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ ع کو مولانا حمید الدین فراہی پر ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا تھا ۔ اس میں اسی سیمینار کی تفصیلات ہیں ۔

عابدی محمد تقی علی

ملا محمود جونپوری

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ ، نومبر ۱۹۹۱ع
جلد ۱۰ ، شمارہ ۱۱ ، ص ۴۹ - ۵۰)

ملا محمود عہد جہانگیری کے ایک بڑے عالم تھے ، اور علم معقولات پر انہیں عبور حاصل تھا ، اس مضمون میں ان کا مختصر سا تعارف ہے ۔

علوی معین الدین

بہرائچ کے بعض صوفیۂ کرام

(معارف اعظم گڈھ ، فروری ۱۹۹۲ع جلد ۱۴۹ ، شمارہ ۲ ، ص ۱۳۱ - ۱۴۹)

یہ مضمون کی دوسری قسط ہے اور اس میں بہرائچ کے شاہ نعیم اللہ بہرائچی کا ذکر ہے ۔

علیم صبا نویدی

نواب تجمل حسین گوپاموی

(سب رس حیدر آباد ، دسمبر ۱۹۹۱ع
جلد ۵۴ ، شمارہ ۱۲ ، ص ۱۹ - ۲۶)

نواب تجمل حسین ایمان کا خاندان نواب انور الدین خان کے عہد میں گوپاموٗ یوپی سے مدراس آیا اور وہیں بس گیا بعد میں ایمان بھی مدراس چلے آئے ۔ مدراس میں علم و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں ایمان کا بڑا حصہ ہے ۔ انکی شاعری کا تعارف ۔

صدیقی محمد صہیب

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، فروری ۱۹۹۲ع
جلد ۱۱، شمارہ ۲، ص ۴۹ - ۵۲)

شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی اور انکی اسلامی خدمات کا سرسری جائزہ

مسعود حسن سید

پروفیسر مولوی محمد شفیع
ایک قاموسی شخصیت

(ہماری زبان، یکم نومبر ۱۹۹۱ع، جلد ۵۰، شمارہ ۳۹، ص ۳)

مضمون کی دوسری اور آخری قسط اس میں مولوی محمد شفیع اورینٹل کالج لاہور کی تصانیف کی تفصیلات ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان پر کس نے کیا لکھا ہے۔

ندوی تقی الدین

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی - نقوش و تاثرات

(الفرقان لکھنؤ، دسمبر ۱۹۹۱ع، جلد ۵۹، شمارہ ۱۲، ص ۳۷ - ۴۵)

محمد احمد پرتابگڈھی مرحوم کے حالات زندگی، ذاتی تعلقات و مشاہدات کی روشنی میں۔

ندوی حامد اللہ

محمد اکبر الدین صدیقی
ایک نئی کتاب کچھ پرانی یادیں

(سب رس حیدر آباد، ستمبر ۱۹۹۱ع
جلد ۵۴، شمارہ ۹، ص ۲۱ - ۲۶)

«محمد اکبر الدین صدیقی - حیات اور کارنامے» کے نام سے محمد قطب الدین فاروقی کی ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ مضمون اسی پر ایک تبصرہ ہے جو حامد اللہ ندوی نے اکبر الدین صدیقی سے اپنے ذاتی مراسم کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

ندوی سید محمد احتباء

نواب سید صدیق حسن خان اور
ان کی خدمات و کارنامے

(البلاغ بمبئی، دسمبر ۱۹۹۱ ع، جلد ۲
شمارہ ۵، ص ۲۲ - ۲۶)

نواب صدیق حسن خان کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کا تذکرہ۔

ندوی محمد عمیر الصدیق

امام ابو سعید اصطخری

(معارف اعظم گڈھ، دسمبر ۱۹۹۱ع جلد ۱۴۸، شمارہ ۱۲، ص ۴۳۷ - ۴۴۳)

امام اصطخری کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا تذکرہ۔

یوسف متالا

شیخ عبد الحق محدث دہلوی

(معارف اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۹۲ع جلد ۱۴۹، شمارہ ۳، ص ۱۸۱ - ۱۹۰)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کا تذکرہ۔

یوسف ناظم

طوے انصاری

(سب رس حیدر آباد، ستمبر ۱۹۹۱ع جلد ۵۴، شمارہ ۹، ص ۹ - ۱۴)

ط انصاری مرحوم کی شخصیت کا ایک نفسیاتی جائزہ۔

متفرقات

رضا کالی داس گپتا

کچھ مطالعے کچھ مشاہدے

(سرم فکر و فن بمبئی، اکتوبر - دسمبر ۱۹۹۱ع، جلد ۳، شمارہ ۸، ص ۲۵ تا ۲۹)

رضا کو اپنے مطالعہ کے دوران میں ادبی اور تحقیقی اعتبار سے جو نئی معلومات ملی ان کا یہاں اندراج ہے۔

شاکرہ ا. و

فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر، کچھ معروضات

(معارف اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۹۱ع جلد ۱۴۸، شمارہ ۱۱، ص ۳۷۰ - ۳۷۴)

جولائی ۱۹۹۱ع کے معارف میں فتح نامہ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر کے عنوان سے ڈاکٹر نور السعید اختر کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، اس مضمون میں نور السعید اختر کی چند تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

عبد الرحیم سید

جامع مسجد اچلپور کا ایک نادر کتب خانہ

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۱ ع جلد ۴۱، شمارہ ۲، ص ۱۱ - ۲۴)

اچلپور ودربھ کے ضلع امراوتی میں

واقع ہے ، اور عماد شاہی دور حکومت میں ملک کا دار السلطنت تھا ۔ یہاں کی جامع مسجد سے متعلق ایک کتب خانہ ہے جس میں عربی ، فارسی اور اردو کے سوا سو کے قریب مخطوطات محفوظ ہیں ۔ مضمون میں اسکی فہرست درج ہے ۔

ندوی مختار احمد

جامعہ سلفیہ بنارس

(البلاغ بمبئی ، نومبر ۱۹۹۱ ع ، جلد ۲ شمارہ ۴ ، ص ۱۷ - ۲۳)

جامعہ سلفیہ بنارس اور اسکی بنیادی دعوت کا تفصیلی تعارف ہے ۔

نور السعید اختر

تصحیح و توضیح

(معارف اعظم گڈھ ، مارچ ۱۹۹۲ ع جلد ۱۴۹ ، شمارہ ۳ ، ص ۲۱۷ - ۲۲۱)

نورالسعید اختر کے مضمون "فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک نظر" پر شاکر کے عائد کردہ چند اعتراضات کا جواب ۔

اکبر رحمانی

کیا اورنگ زیب عالمگیر مندر شکن تھا

(البلاغ بمبئی ، دسمبر ۱۹۹۱ ع ، جلد ۲ شمارہ ۵ ، ص ۳۹ - ۴۵)

مختلف مورخین کے بیانات سے ثابت کیا ہے کہ عالمگیر مندر شکن نہیں تھا بلکہ اسنے درجنوں مندروں اور گردواروں کے لئے بڑی بڑی رقمیں اور جاگیریں عطا کیں ۔

صدیقی عبد المجید

حیدرآبادی تہذیب اور کلچر

(سب رس حیدر آباد ، جنوری ۱۹۹۲ ع جلد ۵۵ ، شمارہ ۱ ، ص ۸ - ۱۴)

تیرھویں صدی کے آخر میں دکن میں مسلمانوں کے ورود اور دکن کی مسلم ریاستوں کا حال مختصراً بیان کرنے کے بعد ان حالات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دکن کی مخصوص مسلم تہذیب کو فروغ دینے میں مدد کی ۔

صدیقی محمد اسلم

عربوں کے نقوش و تاثرات

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ ، جنوری ۱۹۹۲ ع ، جلد ۱۱ ، شمارہ ۱ ، ص ۱۰ - ۱۵)

عربوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں

یورپ پر جو اثـــرات چھوڑے ان کا
سرسری جائزہ۔

عبد الباری

قدیم ہندوستان میں طب

(معارف اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۹۱ ع
جلد ۱۴۸، شمارہ ۱۱، ص ۳۴۴ - ۳۵۷)

مضمون کی دوسری قسط، اس میں چرک سشرت، واگبھٹ اول، واگبھٹ ثانی، چکر پانی دت اور بعض دوسرے اطبائے ہند کی تصانیف اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کمال احمد عیق
مترجم: کبیر احمد جائسی

تاجیکستان میں ہند شناسی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۱ع
جلد ۱۰، شمارہ ۱۱، ص ۱۰ - ۱۸

تاجیکستان کی ان اکیڈمیوں، عالموں اور ادیبوں کا ذکر جو ہند شناسی کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۵۸ سے کام کر رہے ہیں۔

ندوی عمیر الصدیق

(معارف اعظم گـــڈھ، مارچ ۱۹۹۲ع
جلد ۱۴۹، شمارہ ۳، ص ۲۲۲ - ۲۲۶)

زبیر احمد کے ایک استفسار پر بتایا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیویوں اور کنیزوں میں دل رس بانو، نواب بائی اورنگ آبادی محل، اودے پوری محل زین آبادی محل، دولت آبادی محل اور دل آرام کے نام ملتے ہیں۔ ان میں بعض کا مذہب مختلف فیہ ہے۔ مگـــر چونکہ ہنـــدو راج کماریاں مسلمان بادشاہوں سے شادی کرنے کے بعد اپنی ذات اور مذہب سے دستبردار ہوجاتی تھیں اسلئے اس سے کوئی فـــرق نہیں پڑتا۔

ندوی فہیم اختر

مسجد اقصیٰ، ماضی اور حال

(البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۲ع، جلد ۲
شمارہ ۶، ص ۱۹ - ۲۲)

مسجد اقصیٰ کی پچھلی اور موجودہ تاریخ کی روشنی میں بتایا ہے کہ یہودیوں نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد فلسطینیوں پر کیا مظالم ڈھائے۔

مطبوعات و تالیفات

لغات گجری (مرتبہ)
رقعات عالمگیر (مرتبہ)
مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
سوراج (ترجمہ)
رہنمائے صحت (ترجمہ)
ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

ولی گجراتی (مولفہ)
نورالمعرفت (مرتبہ)
غزل ولی تک (مولفہ)
اردو ایسیز (مرتبہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
نوائے وقت (مولفہ)
گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
طوطیان ہند (مرتبہ)
انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)
انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)
مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

نوائے آزادی (مرتبہ)
مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
مبادیات تحقیق (مولفہ)
راگ مالا (مولفہ)

جناب عبدالرزاق قریشی

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری
مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
مقالہ نما مرتبہ محترمہ رقیہ انعامدار

نوائے ادب ، بمبئی

FORM : IV – ROLL NO : VIII

Registration No 32009/50 — رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نوعیت اشاعت	:	ششماہی
نام پرنٹر	:	جناب عبدالمجید پانکا بی کام.(آنرز)
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ		انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پبلشر	:	
قومیت		ایضاً
پتہ		
نام ایڈیٹر	:	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے ، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ	:	ایضاً

میں عبدالمجید پانکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پانکا

• • •

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof N. S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Bombay-400 001

•

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rupees Thirty • *Foreign. Pound Seven*

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۴۲ — شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۹۲ ع

مندرجات

احوالِ واقعی

نجم الدین کی یادگار تقاریر :

سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین کے صاحب زادے ڈاکٹر نجم الدین کی یاد میں انجمن اسلام (بمبئی) کے زیر اہتمام یادگار تقاریر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ امسال ۱۹ مئی ۱۹۹۲ ع کو جسٹس بدر الدین طیب جی، سابق وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) نے ہندوستان میں انگریزی اقلیتوں کے مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں مدلل بلکہ بصیرت افروز تقریر کی۔ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایس ڈی کرنک، بمبئی یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر جلسہ میں مہمان اعزازی کے طور پر شریک تھے۔ انجمن اسلام کے صدر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا نہ صرف ادارہ کی جانب سے استقبال کیا بلکہ ایک "سیمین جہاز" انکی خدمت میں پیش کیا۔ ڈاکٹر کرنک نے انجمن کی کارکردگی میں مسرت کا اظہار کیا اور ہر عملی تعاون کا یقین دلایا۔

جناب حسین دلوائی صاحب، چیرمین، مہاراشٹرا اقلیتی کمیشن اور جناب مشتاق انتولے صاحب رکن مہاراشٹرا ریاستی کونسل، بھی شرکائے جلسہ میں تھے۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر نے شکریہ ادا کیا۔

اردو یونیورسٹی :

حکومت ہند کی وزارت وسائل انسانی ترقی کی جانب سے محترم ارجن سنگھ نے اعلان کیا کہ اردو زبان کی توسیع و ترقی اور تحفظ و بقا کی خاطر اردو یونیورسٹی کے قیام کے تعلق سے ایک مجلس کو تشکیل دیا ہے اور یہ مجلس چھ مہینے کے اندر اپنی مفصل رپورٹ داخل کردے گی۔

اس مجلس کے صدر نشین جناب عزیز قریشی، سابق ممبر پارلیمینٹ اور اراکین میں پروفیسر اے ایم خسرو، پروفیسر آل احمد سرور، جناب مالک رام، پروفیسر

گیان چند جین، ڈاکٹر آدم عثمان شیخ اور ڈاکٹر سید حامد صاحب جیسی اردو نواز شخصیتیں ہیں۔ امید کیجاتی ہے کہ اس مجلس کی رپورٹ پر ایمانداری کے ساتھ غور کیا جائیگا اور یونیورسٹی کا قیام جلد از جلد عمل میں آئیگا۔

اردو مذاکرہ۔

انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک اردو مذاکرہ کا انعقاد ماہ اکتوبر کے وسط میں بمقام اکبر پیر بھائی آڈیٹوریم میں ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کی صدارت میں ہوا۔

محترمہ رشیدہ قاضی، پرنسپل انجمن اسلام گرلز جونیئر کالج اور جناب سہیل لوکھنڈ والا، پرنسپل بیگ محمد ہائی اسکول «نے اردو مہاراشٹرا کے مدارس میں» پر مقالے پڑھے ڈاکٹر زہرہ موڈک، صدر شعبۂ اردو، برہاس کالج اور ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹرہ کالج نے «اردو کالجوں میں» اور ڈاکٹر ایس ایس گوریکر، ڈائرکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے «یونیورسٹی میں اردو» پر مقالے پیش کئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مقالوں کے بعد سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا۔ صدر جلسہ نے مسرت کا اظہار کیا اور مبارکباد دی اور مزید یہ کہا کہ اس قسم کے سیمینار زیادہ سے زیادہ منعقد ہوں تاکہ اردو دوست حضرات و خواتین اس سے استفادہ کرسکیں اور اس سلسلے میں انہوں نے انجمن اسلام کی جانب سے دامے، درمے، سخنے اور قلمے مدد دینے کا یقین دلایا۔ اس سیمینار میں پروفیسر عبدالقادر قاضی، ڈاکٹر عبدالکریم نایک، ڈاکٹر مرزا بیگ، جناب ہارون رشید انصاری، پروفیسر شفیع شیخ، پروفیسر علیم نخشارے، پروفیسر احمد انصاری وغیرہ شریک تھے۔

جناب عبدالمجید پالکا (سیکریٹری انجمن اسلام) نے کارگذاریوں کی رپورٹ پیش کی اور عصرانہ کے بعد ہدیۂ تشکر پیش کیا گیا۔

ایک یاد داشت یونیورسٹی میں:

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ایک یاد داشت یونیورسٹی میں داخل

کی گئی ہے تاکہ ایم اے اردو کلاسیز کو بحال کیا جائے یہ کلاسیں کوئی پچیس سال تک بمبئی کے مختلف تعلیمی اداروں کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ میں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں لیکن شعبۂ اردو کے قیام کے بعد بند کی گئیں۔ اس سلسلے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے معائنہ کیا اور جائزہ لیا اور اپنی رپورٹ پیش کردی۔ اس کمیٹی کی صدر نشین ڈاکٹر نواز موڈی، ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، بمبئی یونیورسٹی تھی۔

عزیز قیسی کا انتقال:

عزیز محمد خاں قیسی ایک اچھے ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار تھے مقرر بھی تھے۔ فلموں میں مکالمے اور کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ تنظیمی کاموں کے علاوہ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے روح رواں بھی تھے، بمبئی کی علمی محفلوں میں اکثر حصہ لیتے اور ادبی مذاکروں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے اور مدلل گفتگو اور وسیع معلومات کے سبب انکی شخصیت مرکز توجہ بن جاتی تھی۔

عزیز قیسی جیسی ہمہ جہت شخصیت کی ناگہانی موت سے اردو کی عمارت کا ایک اہم ستون گرگیا انکی بے لوث اردو خدمات کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اسکا پر ہونا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ آمین۔

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

عبد الماجد دریابادی اور انکے نثری مرثیے

از

ڈاکٹر طاہرہ سارسی ایم اے، پی ایچ ڈی
انجمن اسلام سیکریٹریٹ، بمبئی (۱)

مولانا عبد الماجد دریابادی کی تصنیفی اور ادبی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا۔ وہ مطالعہ کے دھنی تھے، ان کی نظر میں وسعت اور ان کے مزاج میں فطانت بے حد تھی۔ اپنے دور کے باکمال ارباب قلم کی صحبت اور اس پر انشاء و تحریر کا ایک انوکھا اسلوب ان سب چیزوں نے مل کر انہیں عنفوان شباب میں ہی اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب بنا دیا تھا۔

مولانا عبد الماجد نے شعر و ادب، اجتماعی مسائل، تاریخ و فلسفہ، تذکرہ و سوانح اور وفیات جیسے عنوانات پر بہت لکھا اور خوب لکھا۔ مولانا کی تصانیف علم و ادب کا ایسا خزانہ ہیں جن سے پوری نسل بہرہ یاب ہو رہی ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دور میں مولانا ماجد نے آنکھیں کھولی ایک طرف "الہلال" اور "البلاغ" اپنے بے مثال کارناموں سے ہندوستانی عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے تھے اور دیوبند کے مولانا محمود الحسن مالٹا میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو دوسری طرف ٹیگور اور گاندھی جی ہندوستانی عوام کے جذبۂ حریت کو ابھارنے اور انہیں آزادی دلانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے۔

ان حالات میں مولانا شبلی کی صحبت نے مولانا ماجد پر خاصا اثر کیا۔ اکبر الہٰ آبادی نے ان میں تحقیق و تدقیق کی صلاحیت پیدا کی۔ مولانا ماجد کے وہ مضامین جو انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمد علی جوہر پر لکھے ہیں ان سے ان کے مشاہدہ کی گہرائی اور ان کی نظر کی گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد کے تمام مضامین معیاری ہیں۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی لیکن یہاں ہمارا مقصد صرف انکے نثری مرثیوں (وفیات) سے بحث کرنا ہے۔

اردو میں مرثیہ کی روایت عربی، فارسی سے آئی۔ دکن میں مرثیہ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ دکنی شعرا کے مرثیے ہمارے ادبی سرمایہ کے اولین نقوش ہیں۔ بعد میں شمالی ہند اور لکھنؤ میں اس صنف نے بڑا فروغ پایا۔ انیس و دبیر نے اسے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ یہ مرثیے نظم میں ہوتے تھے۔ ان میں شہیدان کربلا کے مصائب اور شہادت کا بیان ہوتا تھا اردو میں شخصی مرثیے لکھنے کی روایت بھی دکن سے شروع ہوئی۔ برہان الدین جانم نے اپنے والد کا پہلا مرثیہ لکھا۔ فارسی میں محمود گاواں کا مرثیہ «پدر» خاص اہمیت رکھتا ہے۔

بعد میں غالب نے عارف، مومن نے اپنے معشوق اور حالی نے غالب پر مرثیہ لکھا غالب پر حالی، مجروح اور سالک کے مرثیے بے حد اہم ہیں۔ فکر و فن کے لحاظ سے بہت بلند ہیں چکبست کے سیاسی اشخاص پر مرثیے بے حد مقبول ہوئے اقبال کا مرثیہ «ماں، فلسفہ اور غم کا عمدہ مرکب ہے۔ یہ تمام مرثیے نظم میں ہیں اور انداز بیاں کے لحاظ سے سب سے جدا ہیں۔ اردو نثر میں مرثیہ کا رواج نہ تھا نثر میں مرثیوں کی ابتدا سرسید اور شبلی کے رفقاء کار نے کی مولانا عبد الماجد کے نثری مرثیے «وفیات» کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ انشائے ماجد حصہ دوم میں ان کے ذیل کے نثری مرثیے ہیں۔

۱) عبد الرحمٰن کی موت ۲) محمد علی ۳) راجہ علی محمد خان
۴) ہم نام نامور ۵) جوش نصیب گول کیپر ۶) شوکت علی
۷) طیب کی موت ۸) ماں کے قدموں پر ۹) سر سکندر حیات
۱۰) نئی نویلی ۱۱) قائد ملت ۱۲) ہمشیر کی رخصتی ۱۳) ایک قوال
۱۴) جشن نوشاہہ ۱۵) یاد غم

مولانا کے نثری مراثی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ذاتی مرثیے چار ہیں۔ ۱) ماں کے قدموں پر انہوں نے ۱۹۴۱ ع میں اپنی والدہ کی رحلت پر لکھا۔

۲) یادِ غم۔ والدۂ مرحومہ کی یاد میں غم کے آنسو کی نذر، ۱۹۴۶ ع میں یہ مضمون قلمبند کیا۔

۳) ہمشیر کی رخصت ۔ ۱۹۴۵ع میں بہن کی وفات پر لکھا۔
۴) نو نویلی ۔ ایک قریبی رشتہ کی بھتیجی کی وفات حسرت آیات پر جو شادی کے
۱۱ ماہ بعد اس دنیا سے اٹھ گئی۔

قومی لیڈروں کی وفات پر اکثر لوگوں نے لکھا ہے۔ مولانا نے ذیل کے سیاسی نامور رہنماؤں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

۱) عبد الرحمٰن نگرامی ۲) مولانا محمد علی ۳) راجہ علی محمد خان
۴) مولانا عبد الماجد بدایونی ۵) تصدق احمد خان شیروانی ۶) مولانا شوکت علی
۷) سر سکندر حیات ۸) بہادر یار جنگ

دو مرثیے اپنے دوستوں کے لکھے ہیں۔

۱ ۔ شفاء الملک حکیم عبد الحمید لکھنوی ۲ ۔ افضل حسین (قوال)

مذکورہ بالا تمام نثری مراثی غم و اندوہ سے لبریز ہیں انکی فضا الم انگیز اور الم آگیں ہے۔ قاری کے دل و دماغ پر خاص اثر کرتے ہیں۔

مولانا ماجد کے نثری مراثی کے تجزیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسلوب شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ اسلوب میں مصنف کے دل و دماغ، اخلاق و عادات، سیرت و کردار کے نقوش پوشیدہ نظر آتے ہیں لکھنے والے کی نظر انہیں خصوصیات پر پڑتی ہے جو اسکی ذات میں ہوتی ہیں اور اس طرح وہ ذات و صفات کا آئینہ بن جاتے ہیں۔

مولانا کی والدہ ماجدہ بڑی مقدس اور برگزیدہ خاتون تھیں انکی سیرت و کردار کی پیش کش میں مولانا نے وہ تمام باتیں بیان کی ہیں جو مرحومہ سے ان کو وراثتاً ملی تھیں۔ مرحومہ کے صوم و صلوۃ کی پابندی اور تقدس مآبی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

«نماز کی پابندی کا نہیں، نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دور میں اکابرین میں بھی بس چند ہی مثالیں ایسی ملیں گی۔ اشراق

چاشت، تہجد کا وہ اہتمام کہ ہم جیسوں کو تو فرض کے لئے بھی شاید ہی نصیب ہو۔ یہ سن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موسم میں بھی ناغہ نہ ہونے پائے۔ گرمیوں کی مختصر راتیں کہ فجر تک بھی نیند پوری ہونی مشکل، یہ ابھی لیٹیں نہیں کہ ابھی تہجد کے لئے اٹھ بیٹھیں۔ جاڑے کے جاڑے پڑ رہے ہیں، صبح ہونے پر لحاف کے اندر سے نکلنا دشوار ہے اور یہ رات کے ایک بجے اور دو بجے اور تین بجے تہجد کے لئے وضو کر رہی ہیں۔"[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ - ۱) مولانا کی والـــدہ پابند مذہب تھیں۔ ۲) مولانا نے پاکیزہ اور مقدس گود اور مـاحول میں پرورش پائی۔ ۳) ماحول کا اثر بچے کی سیرت پر کس حد تک پڑتا ہے۔

ان امور کا اندازہ مولانا کے کردار سے ہوسکتا ہے۔ اتفاق یہ کہ مولانا نے جن بزرگوں کے مرثیے لکھے وہ سب صوم و صلوۃ کے سخت پابند، عق الدین صلـوۃ کے قائم کرنے والے، نیک اور صالح تھے ان کے سینے نور ایمان سے معمور تھے۔ اسلام کی محبت ان کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی تھی۔

افضل حسین قوال کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنی جوانی کے زمانے میں قوال کی حیثیت سے وہ بہت مشہور تھے۔ ان کی آواز میں درد اور اثر تھـا، سوز و گداز تھا۔ پیری میں اس کا مظاہرہ صوم و صلٰوۃ میں خشیت الٰہی کے اظہار میں ہوتا ہے مولانا نے جن کو خراج عقیدت پیش کیا وہ سب خـدا کے پرستار اور عاشـــق رسول تھے۔ مولانا کی ذات بھی اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ وہ صبغۃ اللہ تھے، سچے شیدائے رسول تھے۔ ان کی تصانیف اس بات کی شاہد ہیں، مولانا ماجد عالم، فاضل، شریف اور مہذب انسان تھے۔ انکساری، مروت، ہمدردی انکی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ افضل حسین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"قوال کا ذکر اور صـدق کے صفحـات میں : جی ہاں صـدق عالموں

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۲ از مولانا عبد الماجد دریابادی

زاہدوں، عابدوں کا پرچہ کب ہے؟ نامۂ سیاہ صدق نویس تو خود ہی ایک عاصی اور عاصی ہے؟ اپنے ہم جنسوں کا ذکر چن چن کر کیا کرتا ہے۔"[1]

مذکورہ عبارت پر غور کیجئے۔ اس سے مولانا کا انکسار ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ قوال کو نزع کے عالم میں آبِ زمزم پلایا۔ قوال سے ان کی محبت اور ربط خاص کو بتلایا ہے۔

۲۔ اس کے انتقال پر اس کی میت میں شریک ہوئے، نماز جنازہ پڑھی۔ دوستی کا فرض یوں ادا کیا۔

مولانا سنی مسلمان تھے۔ غیر متعصب تھے۔ منصف مزاج تھے۔ شیعہ حضرات میں بھی جو خوبیاں انکو نظر آئیں، بلا کم و کاست بیان کردیں، معاصرین کی خوبیوں کو بیان کرنے اور انکے کمالات کے اعتراف کے لئے بڑے دل و جگر اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے راجہ علی محمد خان، والیٔ ریاست محمود آباد کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی۔

"دستر خوان کی وسعت، ہر مسلمان کے استقبال کو موجود، خزانہ کی تھیلیاں، ہر کلمہ گو کے لئے کھلی ہوئی، دولت کی تمنا تھی تو مسلمانوں پر زر پوشی کے لئے، اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے، ایک فیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لئے، ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آبیاری کو، ایک جود و عطا کا بادل تھا جو امنڈ امنڈ کر برسا اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبہ حدود میں تشنہ لب قوم کو چھوڑا، نہ افراد کو۔"[2]

انکے ذہن میں شیعہ سنی کی تفریق نہ تھی۔ وہ اس امتیاز سے بالاتر تھے انہوں نے لکھا ہے کہ ایک سنی مسلمان حج کرنے جا رہا تھا۔ جاتے وقت اس

---

۱ وفیات ماجدی ص ۲۴۲ ۲ ایضاً ص ۱۴۷

نے اپنے لڑکے کو راجہ صاحب کے سپرد کردیا کہ وہ اس کی خبر گیری کریں۔ راجہ صاحب نے اس کی کالج کی تعلیم کے اخراجات کے لئے ۸۰۰ روپئے بینک میں جمع کردیئے۔ اگر مولانا تنگ نظر ہوتے تو راجہ صاحب کی اس فراخ دلی کا تذکرہ نہ کرتے۔ راجہ صاحب کے غیر متعصب رویئے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

لکھنؤ کے کسی سنی بیوہ کی لڑکی کی شادی کا وقت قریب آگیا تھا۔ وہ مالی طور پر کمزور اور پریشان تھی۔ راجہ صاحب نے خاموشی سے ایک معقول رقم اخراجات کے لئے اپنے ایک معتمد کے ذریعے اس بیوہ تک پہنچا دی۔

ان مراثی کے مطالعہ سے ممدوح اور مدح نگار دونوں کی سیرت کے مختلف اور مشترک پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے مختلف رہنماؤں اور مشاہیر کی سیرت کا فراخ دلی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

بہادر یار جنگ کی سیرت پر لکھتے ہیں:

«قائد ملت، جس کسی نے اسے کہا اسنے کوئی شاعری نہیں کی، ادبی صنعت گری، لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ایک حقیقت بیان کردی تاریخ کی طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اکل کوڑی قائد ملت اور آج یہ لفظ پہلی بار صدق استعمال کررہا ہے، کاش مجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علی کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا وہی اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ، وہی نبض شناسی، وہی ہمت و عزم غرض بجز محمد علی کی انشاء پردازی کے اور سب کچھ وہی۔»[1]

راجہ علی محمد خان کی مدح میں یوں رطب اللسان ہیں۔

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۵٦

"وہ قومی لیڈر اور نیشلسٹ پارٹی کے افسر ، مسلم لیگ کے صدر اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ، لکھنؤ یونیورسٹی کا حامی اور اودھ چیف کورٹ کا بانی ، ہٹلر کا دوست اور ونسٹن کا دشمن ، آئی. ڈی. ٹی . کا مالک اور ھمدم کا پروپرائٹر ، حکومت کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا منظور نظر نہیں ، وہ ایک مسکین نواز ، یتیم پرور شریفوں کا سرپرست اور حاجت مندوں کا حاجت روا ، بے وارثوں کا وارث ، غریبوں کا دستگیر مہمان نواز و سرچشم ، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا اسکے بڑے بڑے شاہانہ چندے اور لکھوکھا لاکھ کی قومی فیاضیاں سب نے دیکھیں اس کی چھوٹی چھوٹی خیرات اور پوشیدہ دروپاشیوں کی خبر مخلوق میں کسکو نہیں."[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے راجہ صاحب موصوف کی سخاوت ، فیاضی اور انسان دوستی واضح ہوتی ہے .

مولانا عبد الرحمٰن کے بارے میں انکے خیالات ملاحظہ کیجئے :

"وہ صحیح معنی میں درویش تھے گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی . صبر و ضبط فطرت ثانیہ بن گئے تھے ماسوا سے انکی بے تعلقی و بے نیازی زندگی کا جز تھی . بڑی سے بڑی ترغیب نے بھی کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی . بار ہا بڑے سے بڑے کٹھن وقت پڑے اسکا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا . کلکتہ کے زمانہ قیام میں ایک مدت تک معاش کی یہ عسرت رہی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گزار دیا."[2]

دیکھئے ، مولانا کو سیرت نگاری اور کردار کے اجزاء کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے میں کس قدر ملکہ حاصل ہے . مولانا کی درویشی ، بے ریائی ، صبر و ضبط اور شان استغنیٰ کی تعریف کی ہے یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے ، کہ

---

۱ وفیات ماجدی از مولانا عبد الماجد ص ۱۳۸	۲ ایضاً ص ۱۳۸

خود مولانا ایک بے ریا، باکمال درویش، صبر و استقلال کے پیکر اور نام و نمود سے مستغنی انسان تھے۔ اپنی صفات کو مومن کے آئینہ میں کس خوبی سے دیکھا ہے۔

مرقع نگاری کا فن یہ ہے کہ لوگوں کی شکل و صورت اس طرح بیان کی جائے کہ ان کا ہو بہو نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے اور یہ محسوس ہو کہ یہ چل رہے ہیں، مثال کے طور پر تصدق احمد خان شروانی کا خاکہ دیکھئے:

"علی گڈھ کے کھلاڑے ایک سے بڑھکر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علی گڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئی۔ ایک سرخ و سفید قوی و تنومند خوش رو نوجوان، پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لئے خلق ہوا ہے۔ الکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ پھر پھر کر کیسے کیسے حملے کرتی۔ اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام ہس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں یہ تھا علی گڈھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ تصدق۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباس کے مطالعہ سے شروانی کی شکل و صورت ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

مولانا عبد الماجد بدایونی کی مرقع نگاری دیکھئے:

"تقریر اور موثر تقریر ہر موضوع پر کرسکتے تھے اور سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو اٹھا دیتے تھے، لیکن اصل ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی۔

---

۱ وفیات ماجدی ص ۶۰

حبیب رب العالمین کا ذکر پاک کرنے اٹھتے تو اپنے آپ میں نہ رہتے بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی اور خوش بیانی مست ہو ہوکر منھ چومتی "[1]

اس اقتباس میں ادب لطیف کی چاشنی، فقروں اور جملوں کی تراش خراش اور تشبیہ و استعارہ کے لطف نے نثر پارے کو انشاء کا اعلیٰ پایہ کا نمونہ بنا دیا ہے ــــ

بلبل کی طرح بولنا اور چہکنا = شاخ گل کی طرح جھومنا اور لچکنا

مشاہدہ کی حسین مثال ہے تشبیہ کی لطافت قابل غور ہے کہ بہار میں بلبل[2] کا عالم نہ پوچھئے منہ چومتی ہے کلی کلی کا ــــ اسی پر اقتباس ختم ہوتا ہے اور مقرر کی جادو بیانی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔

ادب میں جذبات نگاری کا ایک خاص مقام ہے ۔ مرثیہ میں جذبات نگاری کی معراج کمال انیس و دبیر کے یہاں ہے ۔ ہمیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم "نثری مرثیے نہیں انیس کے مرثیے" پڑھ رہے ہیں ۔ ایک ایک جزئیات کا ہو بہو منظر پیش کردیا ہے ۔ اپنے جذبات آسانی سے بیان کئے جاسکتے ہیں مگر دوسروں کے جذبات کے بیان کے لئے وہی دل، وہی احساس، وہی جذبہ چاہیئے ۔ یہ بات اسی دل میں ہوتی ہے جس میں سارے عالم کا درد ہو ۔ مرنے والے کے غم میں اس کے عزیز و اقارب جس کرب میں مبتلا رہتے ہیں ان کا پرخلوص بیان اسی وقت ممکن ہے ۔ جبکہ لکھنے والے کے دل میں بھی وہی غم و الم ہو ۔ مرشد آباد (Palace) کی کمسن لڑکی نوشابہ کا انتقال ہوگیا اس کے ماں کے دل کا حال نہ پوچھئے ۔ مولانا کے قلم نے اس کو یوں بیان کیا ہے ۔

"اور وہ پردہ نشین غمزدہ ماں ! لوگ کہتے ہیں کہ وہ رو بھی نہیں رہی ہے محض سکتہ کا عالم طاری ہے ۔ بیشک آنسو سلب ہوگئے

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۲۵ ۲ ایضاً ص ٦٦

ہوں گے، لیکن کلیجہ کی کھرچن کو کیا کر رہی ہوگی؟ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینہ میں اٹھتی ہوگی اس کا کیا علاج ہے؟ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ہوئے اجڑتے ہوئے خود زندہ کیسے رہیں۔»[1]

مولانا عبد الماجد کے زیر نظر نثری مرثیے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں ان میں موت کا درد و غم ہے۔ جواں مرگی کا سخت ماتم ہے۔ زندگی کا فلسفہ ہے۔ مولانا موصوف کو حیات و کائنات کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ وہ ذہین اور بالغ النظر انسان تھے زندگی کے حادثات اور واقعات سے نتائج کے استنباط میں انہوں نے نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی سے کام لیا ظاہر ہے کہ کسی عزیز کی موت سے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے غمگینی اور الم انگیزی ناقابل برداشت ہوجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ مرور ایام سے غم کی شـــدت کم ہوجاتی ہے۔ زمانہ زخموں کو مندمل کرتا جاتا ہے، مگر اس کی کسک کسی نہ کسی گوشے میں باقی رہتی ہے۔ «یاد عم» ان کا ایک خاص مرثیہ ہے۔ اپنی والدہ کی موت پر لکھا تھا ان کی والـــدہ کا انتقال ۱۹۴۱ع میں ہوا پانچ سال کے بعـــد ۱۹۴۶ع میں انہوں نے «یاد عم» کے عنوان سے لکھا۔

«پہلے محض مٹی کے ڈھیر کا نظارہ دل کو بے قرار کردیتا تھا۔ اب آنسو مدت ہوئی خشک ہوچکے، غفلت انسان پر کس درجہ مسلط رہتی ہے۔ عبرت پذیری کی عمر کتنی مختصر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے حادثے گزر جانے کے بعد یوں معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے کبھی گزرے ہی نہ تھے مرنا جیسے اوروں ہی کے لئے مقدر تھا۔ اور اپنے لئے تو سدا جیتے رہنا اور اسی طرح چلنا پھرنا۔ کھانا پینا، ہنسنا اور کھیلنا ہے۔»[2]

---

۱ وفیات ماجدی ص ۲۴۰

۲ فروغ اردو (ماجد نمبر) ص ۲۰۵

مولانا کے نثری مرثیوں کا تعلق موت سے ہے انہوں نے احباب، رشتہ دار پڑوسی، برادران دین و ملت، اہل وطن کے موت کے فلسفہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کہیں آہیں، کہیں آنسو، کہیں چیخیں تو کہیں جگر لخت لخت، جا بجا موت کے فلسفہ کے اسرار و عوائض پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ حکیم عبد الحمید لکھنؤی کے انتقال پر موت کے فلسفے کا بیان کرتے ہیں:

«مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگے رہتے تھے۔ اور یہی وقت بھی ہوتا تھا۔ آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا۔ آج قدم اٹھ رہے تھے افسردگی سے، اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے۔ آج نبض دکھائی نہ تھی، نسخہ لکھانا نہ تھا۔ خود حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا، قبر میں اتارنا تھا اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڑھے میں دفن کرنا، تربت پر فاتحہ پڑھنا! — طبیب موت کے منہ میں چارہ گر قضا کے شکنجے میں! تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں میں، لا تعداد نظیروں میں ایک اور اضافہ!»[1]

مذکورہ اقتباس میں الفاظ اور ان کی نشست و برخاست ایک درد انگیز کیفیت کا مجموعہ بن جاتے ہیں، قاری کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ وہ حکیم حاذق ہے موت کے منہ میں سے مایوس مریضوں کو زندہ کھینچ لاتا تھا۔ آج موت کے پنجے میں ایسا پھنسا کے بس۔ ہر ذی حیات کے لئے موت ہے۔ «کلُ نفس ذائقۃ الموت» موت سے مفر نہیں۔ ہر شخص کو مرنا ہے کہتے ہیں کہ ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

اور جب طبیب ہی کو موت آجائے تو

الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔

---

۱ وفیات ماجدی ص ۲۱۲

مولانا ماجد نے اپنے مرثیوں میں جاں کنی کے عالم کی تصویر کھینچی ہے اپنی ہمشیرہ کے انتقال کی درد انگیز تصویر کھینچی ہے اس روح فرسا حادثہ کا عنوان «ہمشیرہ کی رخصتی» ہے۔ معاشرتی لحاظ سے عنوان دوسری کیفیت کی طرف توجہ مبذول کردیتا ہے۔ مضمون پیش ہے۔

«دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا اور جو صابر و شاکر بندی شاید جنت ہی کے لئے بنی تھی جنت کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ غم نصیب ناکارہ سورۂ یٰسین سنا رہا تھا، اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپکا رہا تھا، گررہے والی کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے دیکھے گئے اور کمرہ رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کی صداؤں سے گونج اٹھا۔»[1]

اس قبیل کا دوسرا بیان ملاحظہ کیجئے۔

مولانا کے رشتہ کی ایک بھتیجی کا شادی کے ۱۰/۱۱ ماہ بعد اچانک انتقال ہوگیا «نئی نویلی» کے فکر انگیز عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

«موت کا وقت عجیب پُر اثر، پُر درد تھا۔ لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب، بورڈ آف انڈین میڈیسن کے پیراپنے ممبر، شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز، ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں، ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں، ابھی آنکھوں کی پتلی کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار باقی بھی ہیں! ۔ گویا یہ تدبیریں موت کے فرشتے کا ہاتھ پکڑلیں گی۔ ماں کی دلدوز آہیں اور دعائیں! کس قلم کے بس میں ہے کہ مصوری ماں کے رنج کی کرسکیں؟ لیکن رنج بحمد اللہ مسلمان ماں کا تھا، ادھر غشی سے اٹھی، ادھر سلسلہ پھر دعا و مناجات کا کلمہ تلاوت قرآن سے شروع ہوگیا۔ اے اللہ تیری امانت تیرے سپرد یہ نعمت توہی نے دی تھی اور اسے

۱ وفیات ماجدی ص ۲۳

واپس بھی لے لیا۔ ا مسلمان عورت بھی جنت کتنے طریقوں سے لے سکتی ہے ! جسم رنجور، روح مسرور اب کوئی ہمیں پہچان نہیں پڑتا۔ مرنے والی نے ہراس و اضطراب سے نہیں سکون و اطمینان سے کہا۔ سکرات شروع ہوچکا تھا۔ بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی اور معاً زبان بھی بند ہوگئی۔ ہونٹ دو بار اللہ اللہ کہنے کے لئے ہلے اور ایمان والی روح راضیةً مرضیةً کی بشارت پر دوڑتی ہوئی اڑتی ہوئی روانہ ہوگئی ! ـــ اللہ کی جو بندی اپنے مولیٰ کی یاد میں کسی حال میں غافل نہ ہوئی تھی، جس نے نماز کو شادی کے نغموں اور رخصتی کے ہنگاموں میں بھی قضا نہ ہونے دیا تھا کیسے ممکن تھا کہ مولیٰ کی یاد اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی، کوئی اس یاد کی طرف دوڑ کر دیکھے تو وہ یاد خود کب اس کا پیچھا چھوڑتی ہے؟ «اذکرونی اذکرکم، کی ایک نئی تفسیر، عملی رنگ میں !.»[1]

عالم نزع کی یہ تصویر کس قدر درد انگیز ہے۔ مولانا عبد الماجد بیدار مغز روشن ضمیر، روشن دماغ، انسان ہیں۔ حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے وہ سیاسی رہنما نہیں، مگر دنیا کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ مقامی اور عالمی سیاست کے ہر رخ کو پہچانتے ہیں۔ دنیا میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں انکا جائزہ لیتے ہیں مولانا محمد علی جوہر کی موت عالم اسلام کا زبردست سانحہ اور عظیم نقصان ہے اس سے مسلمانوں اور اسلام کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کا اندازہ آج کے زمانے میں نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کو جوہر سے خاص انس و ربط تھا۔ ان سے گہرے مراسم تھے۔ خط و کتابت تھی۔ دل و دماغ سے دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ایک فقرے میں عالمی سیاست کو بیان کردیتے ہیں۔

«اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گذری، کیسے کیسے اکابر اٹھالئے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں

۱ وفیات ماجدی ص ۴۰ - ۳۹

پر اتحادیوں کا نرغہ ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا، ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لئے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی، تو اس خیال سے کہ جو کوئی چلا بھی جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ کہ شعبان ۱۳۴۹ ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لئے منادی کردی کہ "ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم" اسکے فرشتوں نے اس کے بندوں تک محمدؐ کا ایک وفادار غلام محمد علی کے لئے بھی یہی صدا پہنچادی اے پاک پروردگار، اے سب کو جلانے والے اور سب کو اٹھانے والے، اے مولا، تیرا ارادہ بے شک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عہد کو محرم بنا دینے پر قادر ہے۔ لیکن ہم ناتواں و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش اور اسے بڑے ابتلا، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا! ایسی آزمائش تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہے ہم کم ظرف اس لائق تھے کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لئے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑاتے رہے ہوں، عین اس وقت ہماری سب سے بڑی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے عزیز پونجی ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟"[1]

بیس سال کے عرصہ میں پیش آنے والے تمام واقعات کا احاطہ کرلیا ہے۔ فلسفہ مولانا کا خاص موضوع تھا۔ انکو فلسفہ سے خاص شغف تھا انکی تحریروں

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۱۳ - ۱۱۲

میں جابجا فلسفیانہ نکات اور منطقی دلائل و براہین نظر آتے ہیں۔ مولانا محمد علی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

«اس کے لئے باعث فخـــر بتایا جارہا ہے کہ وہ ''وطـــن'' اور ''ہندوستان'' کے بت کا پجـاری تھا! بے شک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا۔ اس کو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا لیکن اسکی ہندوستانیت ماتحت تھی، اسکی اسلامیت کے 'بادۂ خدا' اور 'وطن' دونوں کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف خدا کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض رکھی ہے اسلئے وطن کا خادم بھی تھا۔»[1]

دلیل کے استحکام کو دیکھئے ایک سلسلہ میں مذہب اور سیاست کو رکھدیا ہے۔ مولانا محمد علی خـدا کے قائل تھے۔ خدا پرست تھے۔ خدا کی مخلوق کی خدمت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ ہندوستان میں بھی اللہ کی مخلوق آباد تھی۔ اسلئے ہندوستانیوں کی خدمت بھی ان پر فـرض تھی۔ منطقی استدلال کا یہ لطیف پہلو قابل غور اور لائق تقلید ہے۔

مولانا کے نثری مراثی اسلوب کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا اسلوب بےحد مؤثر اور دلکش ہے۔ اپنے مضمون کو دلکش بنانے کے لئے انہوں نے مختلف پیرایۂ بیان کے لئے اختیار کئے ہیں۔ مولانا شوکت کی موت پر ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

«باؤنڈری اور، اورباؤنـڈری ہٹ لگانے والے کپتان زندگی کی طرح موت کی باری میں بھی جیت تیری ہی رہی، جلوس زندگی میں ہزارہا نکلے اور ایک سے بڑھ کر ایک پُر شـوکت لیکن آہ ۲۸ نومبر کا جلوس میت! کیا کسی دولہا کی بارات اس دھوم سے چلی ہوگی! کیـا کسی رئیس کی سواری اس شان سے نکلی ہوگی! کیـا کسی سیاسی لیڈر کو اتنے ســوگـوار نصیب ہوئے ہوں گے! دیکھ اے

۱ وفیات ماجدی ص ۱۲۴

شوکت ملت کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک کر رو رہی ہیں کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں، کتنے سفید ریش پیر مرد خود اپنے کو آج یتیم سمجھ رہے ہیں۔ کتنے جوانان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں! ہزاروں ہزار کے اس مجمع سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں، شہر میں، دیہات میں جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و درد مندی کے ساتھ برپا ہے! کروڑوں کی آبادی کس درد دل کے ساتھ تیرا سوگ منارہی ہے! کتنے ایسے ہیں جنہوں نے کبھی تیری شکل نہیں دیکھی تھی آج اپنی جگہ محسوس کررہے ہیں کہ گویا خاص انہیں کا گھر بے چراغ ہوگیا ہے۔[1]

مذکورہ خطاب میں لہجہ کا زور اور انداز دیکھئے۔ ماتم کا سیلاب دیکھئے گھر گھر ماتم بپا کردیا ہے۔ ہر کسی کو اپنے رو میں بہائے لئے جا رہا ہے کس درد آگیں دل اور الم بار قلم سے یہ موتی بکھیرے ہیں۔

عبدالرحمٰن کے مرثیہ میں یوں بھی انداز ہے۔

"الفاظ میں نہیں کہا جاسکتا کہ اس نادر شخصیت اس جامع کمالات، اس حیرت انگیز نمونۂ عمل کی وفات سے امت اسلامیہ نے کیا کچھ کھو دیا۔ بہر حال تقدیر الٰہی پوری ہوکر رہی اور بجز صبر و شکر کے اب کسی کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں، پچھلے سال اسی مبارک مہینہ کے آغاز میں مجھے مرض قلب کے متعلق ایک بہت سخت دورہ پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حرکت قلب فوراً بند ہونا چاہتی ہے اسوقت میں نے ایک مختصر وصیت نامہ تحریر کیا تھا اس کی دفعہ یہ تھی کہ میری تجہیز و تکفین، نماز جنازہ وغیرہ جہاں تک ممکن ہو (منجملہ اور دو تین صاحبوں کے) مولوی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں انجام پائے۔ رفیق اعلا کی رفاقت اعلا کے اختیار کرنے پر حریص عبدالرحمٰن! جس شخص

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۱۶

کو تمہارے خلوص، تمہاری برگزیدگی، تمہارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا۔ کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اسی کے اعتماد کو شکست کر دوگے، اور کون کہہ سکتا تھا کہ اسی بدنصیب کو آہ! تمہاری تعزیت و ماتم میں اشکبار ہونا پڑے گا۔ بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند، عبدالرحمٰن! جس ماں نے اپنی بیوگی اور پھر کم سنی کی بیوگی، تمہیں کو دیکھ دیکھ کر پار کردی، اور جس نے اپنی ساری خوشیوں اور آرزوؤں، حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمہارے مکھڑے کو رکھا آج اسی دکھیاری کے کلیجہ کے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں! کیا یہ حسرت وہ اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جائے گی کہ ایک بار تم اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو آکر پونچھ دو! نوجوانی میں ایک عصمت مآب پردہ نشیں کے ہاتھوں چوڑیاں ٹھنڈی کر دینے والے عبدالرحمٰن! جس دلاری کو تم اسکے ماں باپ سے چھڑا کر، وطن سے بے وطن کرکے، اس کے بچپن کی سہلیوں سے جدا کرکے اسکا ڈولا بڑے شوق و ارمان سے اپنے ہاں لاکر اتارا تھا اور جس کا لباس عروس ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا اور جس حسرت نصیب کو آخری وقت میں تمہاری خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا، آہ آج اسکے دل پر کیا گزر رہی ہے! کیا بجز حشر کے اب تمہارا دیدار اسے نصیب نہ ہوگا؟ معصوم بچی کے معصوم والد عبدالرحمٰن تم تو غیروں کے یتیموں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر رکھتے تھے آج خود تمہاری ننھی معصوم تمہارے غم میں کیسا بلک رہی ہے۔ اس کے سرپر اب وہی ہاتھ پھیرے گا جو یتیموں اور غم زدوں، بے کسوں اور بے وارثوں سب کا حقیقی والی و وارث ہے؟[1]

اس عبارت کے الفاظ تیر و نشتر کی مانند دل میں اثر کر رہے ہیں، اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ کہیں تاثیر پیدا کرنے کے لئے مولانا نے نیا

١ وفیات ماجدی ص ٦٣ - ٦٢

انداز، استفہامیہ انداز، اختیار کیا۔ تصدق احمد شیروانی کی موت پر لکھتے ہیں:

"مرنے والا مرچکا، جینے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزارہا روپئے بے دریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے۔ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا کوئی ہائی کورٹ کا جج، کوئی ہزاروں کما رہا تھا کوئی ہزاروں لٹا رہا تھا کوئی صوبے کا منسٹر، کوئی ایگزیکٹیو کونسلر، کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کالے تھے اور یونہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟ اسکے پہلو میں دل کی جگہ کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا؟ اس کے دل میں امنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اسکے بیوی بچے دوست، عزیز بھائی بند نہ تھے۔ کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے، دنیا میں چین سے بسر کرنے زندگی کے سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہوچکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہوچکا تھا؟ کیا تکلیف اسکے لئے تکلیف اور راحت اس کے لئے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟"[1]

اپنی تحریر میں اثر اور زور پیدا کرنے کے لئے مولانا نے تضاد سے کام لیا ہے۔ یہ خوبی میر انیس کے اکثر مراثی میں پائی جاتی ہے۔ ظلمت کے مقابلہ نور کے بیان سے نور کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے مولانا محمد علی کی موت پر لکھتے ہیں:-

"شب برات، ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت! نمونۂ شب قیامت بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۴۸

رات کو جاگ جاگ کر گذارتے ہیں کون کہہ سکتا تھا اب کی اس رات کو نصیبہ سلا دیا جائے گا ؟ زندگیاں مانگتے ہیں ، صحتوں کے لئے ، گڑ گڑاتے ہیں ، کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت اسے اٹھالیا جائے گا جسکے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا جس کی زندگی ساری قـــوم کی زندگی تھی ، اور جس کی موت اللہ کا نام جپنے والوں کی موت محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے ۱«[1]

تضاد کے پہلو دیکھئے ، شب برات ، شب قیامت جاگ کر گذارتے ہیں ، نصیبہ سلادیا جائے گا تضاد کے ساتھ مولانا نے مقابلہ کا حربہ بھی استعمال کیا ہے اس طرح اپنی تحریر میں زور پیدا کردیا ہے محمد علی کے مرثیہ میں دوسری جگہ کہا ہے ۔

« لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کی خـــبر رکھنے والے مالک ، انصاف کر ، کہ تیرے حبیبؐ و محبوبؐ کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ جب فـاروق اعظمؓ کا قلب تـاب نـہ لاسکا ، تو تیرے اس حبیب پاک کے ہم نام غلام کے غم مفـارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے ! ہم نـادان و نـابینـا تو ادنیٰ سے ادنیٰ آزمـائش کا تحمل نہ کرسکتے ، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لئے دل و جگر کس سے مانگ کر لائیں «[2]

مـــذکـورہ اقتباس میں تلمیح کا پہلو بھی دیکھئے حبیب پاک کے ہم نام ، محمدؐ (علی) حضورؐ سرور کائنات کی وصـال کے وقت حضرت عمرؓ تڑپ گئے تھے ۔ محمد علی کی موت پر ان کے شیدائی تڑپ رہے ہیں تو کیا بات ہے ۔ انکے بعض مرثیے انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے بنے ہوئے ہیں یہ ایسی صنف ہے جہاں ادب لطیف کی تخلیق کے مواقع کم ہیں مگر مولانـا نے یہ مواقع پیدا کردیئے عبدالرحمٰن کا مرثیہ اس کی مثال ہے ۔

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۱۲		۲ ایضاً ص ۱۱۳

«پہاڑی اور پہاڑی غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج پڑی ہوئی ہے۔ جنہیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان ہی میں کوئی سنگ ریزہ لعل یاقوت بن کر نکل آتا ہے، جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے، تو دل پر کیا گذر جائے گی؟ سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے لیکن انہیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا، جنگل میں خود رو بیل اور پتے درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں۔ جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں۔ لیکن گلاب کی تازہ و شاداب کلی بزم ہستی کو معطر کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا ۔۔۔۔۔۔۔ اور قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟» [1]

مذکورہ اقتباس میں حسن و جمال سرور و انبساط کا حسین امتزاج ہے۔ یہ امتزاج ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کہیں منظر کشی بھی ہے۔ یاد فم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔

« مزار کے پائتی ایک نیم کا درخت ہے، ہر سال اپنے موسم میں نئے پھول لاتا ہے، نئے سرے سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ اب کی بھی اس وقت اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیسا سوکھا بے رونق ٹھونٹھ ایسا کھڑا تھا۔ آج کیسا گلزار ہے کیا مہک دے رہا ہے، نرم نرم ہلکی ہلکی پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جا رہی ہیں

---

۱ وفیات ماجدی ص ۵۴

سفید سفید پھول کیسے خوش نما کھلے ہوئے ہیں"[1]

تلمیحات کا برجستہ استعمال دیکھئے۔

"اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کیا اسکا امتحان بھی ہوکر رہا کسی کو سُولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا۔ کسی کو دہکتی آگ میں کودنا پڑا۔ کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی کسی کے خاک اور خون میں تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا۔ کسی کو جلا وطنی نصیب ہوئی کسی کا جسم کوڑے سے لہو لہان کردیا گیا اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔ محمد علی کے لئے کیا یہ قانون بدل جاتا اور جس نے کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کا مزا دیکھ"[2]

لطیف اشارے عبارت کی سادگی اور دلکشی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ عبارت کا حسن، انداز بیان کا زور خاص خوبی ہے کہیں مولانا نے اشعار، مصرعے بھی استعمال کئے ہیں، سر سکندر حیات کے مرثیے بھی دیکھئے۔

"الحمد للہ کہ مسلمان تھا، ہمارا بھائی تھا، توحید کا قائل، رسالت کا معتقد اسلام کا کلمہ گو محمدؐ کی اُمت میں شامل، نماز کا پابند روزہ کا شدت سے پابند، کلام الٰہیٰ کی اشاعت کا ساعی، اپنی بصیرت کے مطابق امت محمدیؐ کی فلاح کا داعی اپنے کو عمر بھر مسلمان کہا، مسلمان سمجھا اور ظرف ماحول بساط کے موافق، اپنے کو مسلمان بنایا اور رکھا فیلڈ مارشل دیول کے پیام رانٹ آریبل چرچل کے سلام، فوج کی سلامیاں لاٹ صاحب کے ہاں حاضر باشیاں، سب

---

۱ فروغ اردو (ماجد نمبر ص ۲۱۱)

۲ وفیات ماجدی ص ۱۱۷

جسم کی کثافتیں نہیں، یہیں زیر زمین دفـــن ہوگئیں۔ روح عرفانی لطافتوں کے پانی سے دھل کـر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک ہوئی اور ان قیـــدوں سے آزاد، ایمان کے بازوؤں سے چڑھی اور یقین و اعتقاد کے پروں سے عالم بالا کی سمت بلند ہوئی، ہزارہا دل والـوں کی دلی دعـاؤں کے سـاتھ ہـزاروں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ـــــہ

تابہ پنداری کہ تنہا می روی! ،[1]

یہ شعر شیخ سعدی کا ہے :-

دیـدۂ سعدی و دل ہمراہ تست تابہ پنـداری کہ تنہـا می روی

[تا کہ تو یہ خیال نہ کرے کہ تو تنہا جا رہا ہے۔ تیرے پیچھے نظروں اور دلوں کے (قافلے) ہیں۔]

شوکت علی کے مرثیہ میں مصرعہ ـــــہ وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ کی برجستگی دیکھئے :-

« وطن کی پوجا کے لئے سوشلزم اور کمیونزم کی خدائی کے لئے اور نئے نئے ناموں کے ساتھ طرح طرح کے آنے والے فتنوں کے لئے جیل جانے والے تختہ دار چڑھ جانے والے، اب بھی یقیناً پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن ملت اسلامیہ کے فروغ و برتری کے لئے، دین الٰہی کی نصرت کے لئے اپنا کاروبار مٹا دینے والا اپنے جاہ و مال دونوں کو ذبح کردینے والا، اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لئے پیش کردینے والا اب کون اٹھے گا؟

وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ »[2]

ہم سب اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف ہم کو لوٹنا ہے۔

---

۱ وفیات ماجدی ص ۱۷۶ ۲ ایضاً ص ۱۲۵

عبدالرحمٰن کی موت پر کہتے ہیں ۔

صورت از بے صورتی آمد برون بار گشـــــد انا الیه راجـــعون[1]

مصرعوں اور شعروں کے برجستہ استعمال نے عبارت میں لطف و اثر پیدا کردیا ہے ۔

مولانا عربی فارسی کے جیّد عالم تھے ۔ عربی کے فقرے جا بجا استعمال کتے ہیں ۔ تصدق احمد شروانی کی موت پر لکھتے ہیں ۔

" ۱۹۲۰ع کی وہ ہنگامہ خیز تحریک خلافت و ترک موالات شروع ہوئی ۔ جس نے سارے ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک ہلا ڈالا ۔ تصدق اس وقت ایک کامیاب بیرسٹر ہوچکے تھے اب اپنے پیشے میں نامور ، گھر کے خوشحال پہلے ہی تھے اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے ۔ قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ پریکٹس چھوڑ دو ، بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کــــرو جـــو ســــر اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے ۔ "السابقون الاولون " میں ایک یہ بھی تھے ۔ غالباً ۱۹۲۲ع تھا کہ علی گڈھ میں عدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا ، احمد شیروانی ہنگامہ فرو کرنے گئے ۔ پولیس اور مقامی حکام کو دل کے بخار نکالنے کا موقع ہاتھ آگیا ۔ دھر پکڑے گئے ۔ الٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا ، گئے تھے آگ بجھانے ، مجرم آگ لگانے کے قرار پائے اور وہ جس کا کام قصور داروں کا چھڑانا تھا اور خطا کاروں کو رہائی دلانا تھا ، اب خود مجرم و بے خطا قید فرنگ میں اسیر و محبوس تھا ا قید اور پھر قید سخت ا غالباً کچھ روز کے لئے قید تنہائی بھی اس رئیس اور رئیس زادے کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی ؟ بڑی بڑی تکلیفوں کو چھوڑیئے ۔ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مچھروں ہی نے جھنجھوڑ ڈالا کہ بے حال ہوگئے اور بیمار بن کر نکلے ماں

---

۱ وفیات ماجدی ص ۵۵

باپ نے نام تصدق رکھا تھا۔ کیا یہ نام نام ہی رہتا؟ اور عزت کی آرام کی، مال کی، جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی»[1]

عبدالرحمٰن کے مرثیہ میں لکھتے ہیں۔

«تمہاری آنکھوں سے آج پردے اٹھ چکے ہیں لفظ وعبادت سے گزر کر آج تم معنی و حقیقت کے محرم اسرار ہوچکے ہو جمال سرمدی کے لئے بے حجاب نظارہ سے تم آج شاد کام ہوئے ہو، تمہیں ان خوش نصیبوں کا واسطہ اور جس بے نیاز کی حریم ناز میں شرف باریابی حاصل کرچکے ہو اس کی عظمت و کبریائی کا صدقہ کہ ''لَهُم مایشاؤن،، کے مرتبہ پر فائز ہوکر اور راضیةً مرضیةً کے خلعت سے سرفراز ہوکر اور ''لهُم مایشاؤن فیہا ولدینا مزید،، کے انعامات سے مالا مال ہوکر اپنے گنہگار اور بدنصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ اور اللہ کی یکتائی کا زبانی اقرار کرنے والوں کے حقوق کو فراموش نہ کر جانا، دنیا نے تمہیں اگر نہیں پہنچانا تو معذور تھی اہل دنیا اگر تمہاری قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کرسکے تو کچھ حرج نہیں جس سے تم کو اور ہر نیک و بد کو آخری اور دائمی سابقہ پڑنے والا ہے وہ تو بہر حال بے خبر نہیں۔ ''کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال و الاکرام،،

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ»[2]

راجہ علی خان کے انتقال پر لکھتے ہیں:۔

«جس حکمت کاملہ نے، عالم کے سرور و سردار کو مخاطب کرکے ''انک میتٌ وانہم میتون،، کی منادی کردی اس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہوسکتی

۱ وفیات ماجدی ص ۱۴۶ - ۱۴۷ ۲ ایضاً ص ۶۴

تھی؟ جو بھیجے گئے تھے وہ واپس بلا لئے گئے اور جس نے بھیجا تھا وہ اسی آن اور اُسی شان، اسی جاہ اور اُسی جلال، اسی تزک اور اُسی احتشام، اسی دارائی اور اُسی کبریائی، اُسی جمال، اُسی دلربائی، اسی ناز اور اسی محبوبی، اسی حسن اور اُسی زیبائی کے ساتھ جوں کا توں قائم، حیؔ و قیومؔ!»

مٹ گیا نقش احمد و محمود ره گیا، لا الہٰ الا اللہ![1]

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مولانا نے، اردو عبارت میں زور اثر اور لطافت پیدا کرنے کے لئے عربی فقروں سے مدد لی۔ بعض مقامات پر مولانا کے اسلوب نے ایک بے تکلف سادگی اور سادہ تکلف اختیار کرلیا ہے۔ خوش نصیب گول کیپر کا مرثیہ (GOAL - KEEPER) «تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد»[2]
اس فقرے سے شروع ہوتا ہے۔

«بی بوبلی» کے مرثیے میں تحریر کیا ہے»

«شادی کو پورا سال بھی کہاں گزار، دس ہی گیارہ مہینے تو ہوئے»[3]

مختصر یہ کہ مولانا کے مراثی خاص خصوصیات کے حامل ہیں۔ اس میں وسیع تمدن کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں رثائی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی ہے۔ اثر و لطف بیان ہے، زور ہے، سادگی، دلکشی ہے، منظر نگاری ہے۔ اسلوب کے دلچسپ پیرائے ہیں۔ انشائیہ کے لطیف اشارے ہیں، تاریخی اشارات اور تلمیحات ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے نثری مراثی ادب عالیہ (CLASSIC) میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

۱ وفیات ماجدی ص ۱۳۷ ۲ ایضاً ص ۱۴۵ ۳ ایضاً ص ۳۹

دکنی ادب میں ثقافتی عنصر کی چھان بین

از

ڈاکٹر نور السعید اختر
شعبۂ فارسی، مہاراشٹرہ کالج، بمبئی

(۲)

۱۰ داستان بہرام گور و بانوی حسن از امین گجراتی و دولت بیجاپوری

امین گجراتی نے اس مثنوی کی ابتدا کی اور دولت شاہ دولت نے اسے ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ع میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اس مثنوی کا ماخــذ کوئی فارسی مثنوی ہے جس کا ســراغ ابھی تک نہیں ملا۔ البتہ فاصل سورتی کی اسی موضوع پر لکھی ہوئی مثنوی (۱۰۶۶ھ) دستیاب ہے اس مثنوی میں فوق الفطرت عناصر کی بہتات ہے۔ سفید دیو نے بہرام گور کی جس انداز میں ضیافت کی تھی اس کا منظر ذیل کے اشعار میں پیش ہے۔

(۱) سفید دیو کے باغ کا منظر - شعر نمبر ۱۱۶

(الف)

دھــرا تھا وہاں پرتگالی شــراب　　کئی جنس کے وہاں دھرے تھے کباب
کئی حــوان میوہ ســو اقسام کے　　کیتک نام لیویں بہوت نام تھے[1]

(ب)

بہوت کھان میوے سوں معمور تھے　　وہاں انجیر و انگور و سیب تھے[2]

(ج)

طعامان ســو اقسام کے طیار کر　　کھلانے لگے سب کوں تکرار کر
ضیافت بڑی شان سیں اس کیا　　تواضع میں دل ہاتھ میں کا کیا[3]

(۱) قسم قسم کے کباب (۲) میوں کے سو اقسام (۳) سوکھے میوے اور مختلف پھلوں سے لبریز برتن (۴) سو قسم کے کھانے (کھانوں کی تفصیل نہیں دی)

۱　مثنوی بہرام گور اور بانوی حسن مرتبہ راقم الحروف ص ۱۰۷-۱۰۸ غیرمطبوعہ
۲　ایضاً ص ۱۱۴　　۳　ایضاً ص ۱۸۷

۱۱ مثنوی بہرام و گل اندام از طبعی گولکنڈوی[1] ۱۰۸۱ ھ

طبعی آخری قطب شاہی تاجدار ابوالحسن تاناشاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے بہرام و گل اندام کے نام سے ایک عمدہ مثنوی لکھی ہے۔ دراصل یہ مثنوی امین سبزواری کی مثنوی «بہرام و گل اندام» کا جزوی ترجمہ ہے اس میں طبعی کے طبعزاد اشعار و غزلیں بھی ہیں۔ راقم الحروف نے اس مثنوی کو طویل مقدمہ اور تصحیح متن کے ساتھ ترتیب دے دیا ہے۔

کیا شاہ گنجور قیصور کوں — اشارت سوں لا آب انگور کوں
گئے چار سُو ترک خو ماہتاب — کئے لا کو حاضر شراب ہور کباب
بھریا لعل الماس کے جام میں — دیا بیگ ساقی نیکو نام نے
دونو شاہ پینے لگے جوں شراب — گلے چاند رشکوں جلے آفتاب
بُلا چاشنی گیر قیصور شاہ — کیا بیگ دے لا کو سمرا بچھا
جڑت کے لی تخت آفتاوے فراش — تلے اس کے زربفت کی دھر قماش
کھڑے ہو کو شاہاں کے باناں دھلائے — کہ جوں باغ رنگین سفرا بچھائے
چنے روغنی لا کو روٹیاں قطار — مزعفر کے چینیاں رکھے بے شمار
رکھے انگریاں لا کو دم پخت کے — تمام اس میں گل کو مرغیاں پکے
رکھے لا کے خشکے کی چینیاں بھرے — اپر قاض[2] کے اس کے بریاں دھرے
سموسے بھرے مشک ہور قند کے — مہلیاں اپر ساق عروساں رکھے
گلاب او کھیر نے حلوا پکا — تمام اس منے مغز بادام بھا
رکابیاں میں بھر کر رکھے حاجا — کندوری میں کئی جنس کا تر میوا
انناس ہور رائے کیلے مِٹھے — شکر نیبو ہور خمرکاں تھے کھٹے
کھول کیا کندوری میں سب کوچ تھا — کسی کوں وہاں کوئی نیں پوچھتا
پتا کھاں سب شہر کی خلق کھائی — سنگات اپنے بند کو مولاں لجائی

طبعی کی مثنوی، امین سبزواری کی مثنوی «بہرام و گل اندام» کا جزوی ترجمہ ہے۔ دونوں میں ضیافت کا ذکر ہے لیکن طبعی نے روغنی روٹی، دم پخت

---

۱ مثنوی بہرام و گل اندام از طبعی گولکنڈوی ۲ قاز (راج ہنس)

اور قاز کی بریانی کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔

(۱) کباب (۲) روغنی روٹی (۳) مزعفر (۴) دمپخت (۵) مرغیاں (بھونی ہوئی) (۶) خشکہ (۷) سہلیاں (۸) ساقِ عروساں (مغزیات سے بھرے ہوئے گول میٹھے سموسے (۹) قاز کی بریانی (راج ہنس کی بریانی) (۱۰) سموسے (مشک اور قند کے) (۱۱) حلوہ (گلاب اور کیسر کا) (کیسر بمعنی زعفران) (۱۲) کئی جنس کا تر میوہ (تر۔گھی سے لبریز) (۱۳) مختلف قسم کے پھل اور خشک میوے
چاشنی گیر[۱]، سفرا (دستر خوان) آفتابے (لوٹے)

۱۲ جنت سنگھار از ملک خشنود

سنہ تصنیف ۱۰۵۵ ھ کل ابیات : ۳۲۲۵ (صحیح تعداد اشعار ۳۱۴۷)

افسوس ہے کہ اس طویل مثنوی میں پکوانوں سے متعلق تفصیل نہیں ہے۔ ملک خشنود قطب شاہی عہد میں سفیر بناکر بیجاپور بھیجا گیا تھا دراصل یہ مثنوی ہاشمی گنجوی کی "ہفت پیکر" اور نظامی کے جواب میں لکھی گئی امیر خسرو دہلوی کی "ہشت بہشت" کا جزوی ترجمہ ہے زبان کے اعتبار سے اسکی کافی اہمیت ہے۔

بہوت جنساں کے تر میوے منگائے
کندوری پہ بدل چھند سوں بچھائے
کئے لک جنس کے نعمت سگل ہار
سگل یو دیکھتا تھا مرد ہشیار[۲]

(۱) کئی قسم کے تر میوے (۲) لک جنس کے الوان نعمت
(۲) کندوری (گوشت کا کھانا) دعوت

---

۱ وہ مخصوص باورچی جو اپنے آقا کو کھانا دینے سے پہلے کھانا چکھتے ہیں تاکہ کھانے کا ذائقہ اور زہر آلودگی کا پتہ چل جائے۔

۲ جنت سنگھار از ملک خشنود، زیراکس، انجمن ترقی اردو کراچی

۱۳ مثنوی سرو و شمشاد از غلام قادر سامی اورنگ آبادی (۳۳۶۶) ابیات

ولی دکنی کی غزلیہ شاعری کے بعد دکن میں مثنوی نگاری قدرے ماند پڑگئی تھی۔ تاہم سراج اورنگ آبادی نے «بوستانِ خیال» لکھکر مثنوی نگاری کی رفتار کو تیز تر کیا۔ اسی دور میں عارف الدین خاں عاجز نے «لال و گوہر» لکھی اور اسی قصہ سے متاثر ہوکر غلام قادر سامی نے «قصہ سرو و شمشاد» کو منظر عام پر لایا۔ سامی نے دکنی طرز معاشرت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ لہذا اس میں زندگی کے مختلف رنگ بخوبی نمایاں ہیں ایک ضیافت کا ذکر کرتے ہوئے سامی بے شمار اقسام کے پکوانوں کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں

وصل رہیمی ضیافت

ہوا اس دم سرانجام ضیافت　　ہوا اظہار آثارِ محبت[1]
لے آئے روبرو سب خوان نعمت　　مزعفر اور بد اور نان نعمت
پراٹھے، اور دوپرتی سات پرتی　　بہ کردہ پنجہ کش کجا سات پرتی
چپاتی شیرمال و نان تنکی　　ہونی تھی کاو دیدہ جان تنکی
طعام اقسام کے اوس دم تھے موجود　　ملائی اور مربے، فرنی اور دود
مثمن اور کتاب اور آش بغرا　　متنجن اور کباب اقماس اُعرا
رشالا اور نمش اور زیر بریان　　من و سلوا کاہ شرہ جیسے چرمان
عجب خاگینہ و کوکو و کلمہ　　بہ قلیہ سولہی و چشیرہ دُلمہ
قتلمہ لگبرہ ماہیحدہ و قاق　　من و عن نکشتری کیپا و قوتماق
حسبی کوفتہ، شامی و تکہ　　پنیر و ماستابہ دوغ چکہ
کماچ و حرما و حلوا بکسمات　　قطایف گل شکر، سنبوسہ، جغرات
سہالی اور کچوری پوری　　گلابی پیڑہ اور ریوڑی کپوری
تھے لبریز گلاب و مشک و عنبر　　بہ مرغوبہ و شش رنگا و شب دیگر
ہزاروں قسم کے قلیہ پلاوے　　دو پیازہ سبکڑوں، جلاوے
مٹھائی کے ہزار اقسام سب تھے　　بہ برفی در بہشت اوس میں عجب تھے

۱　مثنوی سرو و شمشاد از غلام قادر سامی۔

اچاروں کے کہاں تک نام بولوں کہ اوس میں خاص تھے یا عام بولوں

الوان نعمت کی تفصیل

(۱) مزعفر (۲) پراٹھے (۳) دو برتی اور سات برتی روٹی (۴) چپاتی (۵) شیرمال (۶) نان تنکی (۷) ملائی (۸) مربّے (۹) فیرنی (۱۰) دودھ (دود) (۱۱) مشّمن (۱۲) کَشتّاب (چُھری سے بنایا ہوا قیمہ) (۱۳) آش بغرا (۱۴) متنجن (۱۵) کباب اقماس اعرا (کذا) (۱٦) رشالا (گنے کے رس میں ابالے ہوئے چاولوں کی کھیر) (۱۷) نمش (مصری ملا ہوا دودھ) (۱۸) زیر بریان (۱۹) کاہ شـــرا (کـــد) (۲۰) حاگیمہ (۲۱) کوکو (انڈوں کے کبـاب (۲۲) کُـلمہ (قیمہ بھری ہوئی بکرے کی آنت) (۲۳) قلیہ بوٹی (بوٹی کا قلیہ (۲۴) دُلمـہ (چشیرہ) روغـن دار مسـالے سے بھری ہوئی بکرے کی آنت (۲۵) قتلمہ (۲٦) لنگبرہ (چھوٹے بکرے کی ران ؟) (۲۷) ماہچہ (کذا) (مائدہ دسترخوان) (۲۸) وقاق (کذا) قاق : سوکھے گوشت کا کھانا (۲۹) تکشتری (کذا) (۳۰) کیپا (۳۱) قونماق : ایک قسم کی خـاص روٹی جو آٹے ، پیاز ، گھی اور انڈوں سے بنائی جاتی ہے (۳۲) حسینی کوفتہ (۳۳) شامی (کباب) (۳۴) نکتہ (۳۵) پنیر (۳٦) ماستابـہ (۳۷) دوغ (دہی) (۳۸) چکہ (پانی نکالا ہوا دہی جس سے شـــری کھنڈ بناتے ہیں) (۳۹) کمـاچ (۴۰) خـــورمـا (۴۱) قطایف (قطیرہ) بارہ گوندھا ہوا آٹا (۴۲) گل شکر (۴۳) سنبوسہ (۴۴) حفرات (۴۵) سہالی (ایک قسم کی خستہ تلی ہوئی روٹی (۴٦) کچـــوری (۴۷) پـوری (۴۸) گلابی (۴۹) پیڑہ (۵۰) ریوڑی (۵۱) کپوری (۵۲) گلاب ، مشک و عـــنبر (۵۳) مرعوبہ (۵۴) شش رنگا (۵۵) شب دیگر (شب دیگ) شلجم اور گوشت کے ساتھ رات بھر پکایا ہوا سالن (۵٦) ہزاروں اقسـام کے قلیے پلاؤ (۵۷) سینکڑوں قسم کے دو پیـارے اور شـــیرین حلاوے (۵۸) ایک ہـزار اقسام کی مٹھـائیـاں (۵۹) برفی (٦۰) مختلف قسم کے اچار (خاص اور عام قسم کے)

۱۴ حفت سنگھار از ملک خوشنود کی تلخیص

مثنوی قصہ بہرام گـور (ہشت بہشت[۱]) از محمد سعید الدین خان سعید

۱ قصہ بہرام گور از محمد سعید الـدین خان سعید ، حیدرآبادی ، مخطوطـہ مملوکہ انجمن ترقی اردو ، کراچی ۔

اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۹ ھ ہے یہ مثنوی سعید نے نواب منصور جنگ کی فرمائش پر لکھی تھی. مسز سعیدہ اختر راقم کے ساتھ اسے مرتب کررہی ہیں.

چلا رومی پری پیکر کے دنبال — ہوا اس مجلس میں آکر شامل حال
اسی ساعت میں دستر خوان آیا — طعام نعمت الوان آیا
طعام خوش گوار بادشاہی — کہ تھے اس میں کباب مرغ و ماہی
سلچی آبتابہ لے کر آئیں — پری زادوں نے ہاتھ اوس کے دھلائیں
ہوا جب وہ شریک خوان نعمت — کیا شکرانۂ احسان نعمت
ہوئی کھانے سے مجلس اگھائی — چلے جام شراب ارغوانی[1]

(۱) مجلس : دستر خوان (۲) طعام نعمت الوان (طعام خوش گوار الوان نعمت) (۳) ہاتھ دھلانا (مہمانوں کو عزت دینے کے مترادف ہے) (۴) سلچی (سلپچی سلاپچو) ہاتھ دھلانے کا برتن (سلفچی) (۵) آبتابہ - آفتابہ : ہاتھ دھلانے کا ٹونٹی دار لوٹا (بدھنا) (٦) خوان نعمت : دستر خوان ، نہایت سلیقہ دار (۷) مجلس اگھانا ضیافت میں مدعو کرنا

۱۵ مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال از غواصی

غواصی ملک الشعرا وجہی کا جانشین ہے . اس کا تعلق عبد اللہ قطب شاہ کے دربار سے تھا تین مثنویاں اور دیوان دستیاب ہوئے ہیں. یہ کتابیں طبع ہوچکی ہیں. غواصی کی مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال کو دکنی ادب میں اہم مقام حاصل ہے . ذیل کے اقتباس میں سیف الملوک کی شادی کی ضیافت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے . اس میں جدا جدا الوان نعمت کے نام نہیں ہیں. یہ مثنوی شاہی شادی کی ضیافت کے تمام لوازمات سے آراستہ ہے . غواصی کے فن کا یہ کمال ہے کہ دعوت کا منظر آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتا ہے. ملاحظہ کیجیئے .

جو مجلس کوں کھانا کھلانے پہ آئے
صفا خوش کندوریاں سو لیا لیا بچھائے

[1] قصہ بہرام گور از محمد سعید الدین خان سعید حیدرآبادی، نقل ص ۵۲-۵۳

کندوریاں شہانے سو لک جنس کیاں
رنگا رنگ شیرینیاں ہر یک جنس کیاں
رکھے شیرینیاں لانے کر لھار لھار
گگن اونچے راساں دو کئے اس شمار
جو پھول نیر سوں ہاتھ سب کے دھلانے
کندوری کھلانے لے جا بیسلانے
رنگا رنگ لک جنس کیاں نعمتاں
جو ہر ایک نعمت میں کئی لذتاں
سو اسماں بادل کوں سکات لے
چندر سور کے جام دو ہاتھ لے
کمر باندھ خوش ہو اپے آبدار
عطر ساری مجلس پر رکھ ٹھار ٹھار
جل امرت لیا لیا پلانے لگیا
پلا پیاس بھر بھر چلانے لگیا
خلائق ولے در ولے خاص عام
کندوری تے فارغ ہوئے خوش تمام
حرت کے طبق پر اک اسماں تھے
بھرا اس میانے تکٹے پٹیاں پان تھے
عنبر عور خوشبو، کندم پھول مال
پھرانے لگے خان صاحب جمال[1]

۱ صفا خوش : دستر خوان ۲ کندوریاں : الوان نعمت ۳ کندوریاں شہانے : شاہی
۴ راس : ڈھیر ۵ پھول نیر : عرق گلاب ٦ آبدار : پانی پلانے والے ۷ جل امرت
آب حیات جیسا پانی ۸ پان پٹیاں . پٹی پان کے بیڑے ۹ پھول مال : پھولوں کے ہار

۱٦ مخزنِ عشق یا باغ جاں افزا از وجدی

اس مثنوی کے مصنف کا نام وجیہ الدین اور تخلص وجدی تھا۔ دکن کے

۱ سیف الملوک بدیع الجمال از غواصی، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی (ہندی)
ص ۲۰۵ - ۲۰٦

مشہور صوفیاء کرام میں وجدی کا شمار ہوتا ہے۔ وجدی نے شیخ فرید الدین عطار کی شہرۂ آفاق مثنویوں منطق الطیر اور گل و ہرمز کا «پنچھی باچا» (پنچھی بھاشا) اور «تحفۂ عاشقاں» کے نام ترجمہ کیا ہے وجـــدی کے حیات و کارنامـوں پر محمد بن عمر صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے۔ وجدی کی تیسری اور ضخیم مثنوی کا نام «مخزن عشق» اور «باغ جان افزا» ہے۔

نصیر الدین ہاشمی صاحب اس مثنوی کی بابت رقمطراز ہیں کہ

«یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں جنگ و پیکار کی ہنگامہ آرائی، عشق و محبت اور عیش و نشاط کی پرلطف داستان سموئی ہے۔»[1]

اوریئنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سابق کتب خانۂ آصفیہ) میں مخزن عشق کے دو مخطوطے ہیں۔ مخطوطہ نمبر ۲۲۵ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحـــہ ۱۷ سطـری ہے۔ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۴۵ ھ ہے۔

«مثنوی مخـزن عشق» دکنی تہذیب و تمدن کی بھرپور نمائندگی کـرتی ہے۔ اس میں دکنی رسومـات کی مرقع کشی نہایت تفصیلی انداز میں موجود ہے۔ ذیل کے اقتباس میں شاہی ضیافت کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ساٹھ سے زیادہ الوان نعمت کی تفصیل موجود ہے۔ دکھنی اور غیر دکھنی پکوانوں میں تخصـص بھی کی گئی ہے۔ دکن کی یہ اولین مثنوی ہے جس میں دکھنی پکوانوں کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے بخصوص دکھنی کھانوں کی طرف وجدی کی نشاندہی ملاحظہ کیجئے

(۱)	چکولیاں نرم و نازک با لطافت	دکھن کے ملک کی پاکیزہ نعمت
(۲)	دکھن کے سینویاں باریک جیوں تار	اچھی محبوب تر جیوں زلف دلدار
(۳)	سروالے بوٹوی گھیو دودھ میں تر	ادگ سی جس منے بادام و شکر
(۴)	برنج دکھنی مصالح دار خوش باس	سلونے کوفتیاں کا خاص لـواس

[1] اردو مخطوطات (کیٹلاگ) اسٹیٹ سینٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) جلد اول از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۰۳ و ۱۰۴ (مخطوطہ نمبر ۵۲۵ اور ۶۸۷)

مثنوی «مخزن عشق» میں کھانوں کی تفصیل

لگے مجلس منے دو رنگ لیانے   سراون ماس[1] کی رت کر دکھانے
کئے ایکس طرف سوں بزم گلزار   سمن کا باغ کیتے زعفران زار
.اک آوے وہیں کھانے کی باری   لگے باناں دھلانے کارباری[2]
.ر مداراں منے پاکیزہ زرکیاں   منے کیے آفتاوے ہور چلمچیاں
.راں لاکر مچھانے کھول یکبار   نچھل مودار کے مُہرے طلا کار
منے نارہ کھوڑیاں کے کھول تسپر   کدوریان چھینٹ بندوکیاں سراسر
.ران دھرنے لگے اقسام ناناں   پبجے کش اور گردی نافتاماں
چپک رم و نازک نان بادام   ملایم نان باقر خانیاں سام
کلچے روغنی، جیوں روئے محبوب   کماچان خاص تر اوستے ادک خوب
زبان گاؤ لذت دار شیرین   اچنبک رم گولر سرخ رنگین
چپاتاں کاغذی، تنکیاں حریری   بدل ماچان نرم نازک خمیری
.مل جیوں نافی سے خاص مانڈے   ہر ایکس کے انگے لیا لیا کے مانڈے[3]
.راں لیانے لگے الوان نعمت   کہ دیکھے انکھیان کون آنے حسرت
.. لاواں کی حس کے رنگ در رنگ   کہ جس کون دیکھ نظراں ہورہیں دنگ
جو شکرفی پولاؤ آوے نظر میں   پڑے یاقوت کون حسرت جگر میں
ہرے پولاؤ کے رنگ سون زمرد   گنوائے تاب دل کا ہی تردّد
.ک خوشبوی مکمکتا[4] مزعفر   مزے میں رنگ و بو سون روح پرور
ہا بھی پلاو اس نہایت خاصا   جو ہر لقمے سون تازہ ہوئے خلاصا
مٹھا لبی[5] پولاؤ آوے جو آگیں   سوتی سو اشتہا کے بخت جاگیں
سرس فرمان پلاو ایسا جو کھائے   تو اسکا جان و دل روں روں[6] مزا پائے

---

۱ سراون ماس ـ شراون کا مہینہ   ۲ کارباری : کاربھاری، نوکر چاکر،
گردش پیشہ   ۳ مانڈے : مانڈنا، پیش کرنا، رکھنا [مراٹھی मांडणे]
۴ مکمکتا : مہکتا   ۵ میٹھا لنبی : میٹھا لیمو : موسمبی
۶ روں روں : رواں رواں

کٹے جیوں زیر بریاں قاب بار
قبولی کی لـــذت کہی نہ آوے
نیکا یخنی کا شولا روح پرور
زباں کوں چاشنی بخشے مطنجن
سرس پاکیزہ خشکا ما مصالے
سراوے خشکۂ دودی کوں ہر کوئی
سو اس پر شصت رنگا ای یوں دس
عجایب سب سوں گیلانی کی لذت
دہیں چھاہیاں لسن مرچاں نمکدار
ملائی دودھ کی نازک ملایم
پیالی آش کی خاصی ہر ایک تھار
بورانی سادی اور دلدل[1] پودانے
سرولے بولوی کھیڑ دودھ میں تر
برنج دکھنی مصالح دار خوش باس
امیرانی لپٹے کی چنگی[3] کھـــیر
مصفّا دودھ کی فرنی گلابی
رکھے ویسیچ کے کی بھانت[4] سالن
مزے کا سادہ قلیا اوسٹے فائق
چکوٹ[6] دم پخت قلیا چاشنی دار
اچھے مرغیاں کا قلیا چرب و خوشتر
لوے[8] تیتر بٹیراں کا قلیہ خاص
کہوں کیوں قلیۂ بینگن کی لذت
چچونڈے ہور ترایاں ہور کریلے

اولھی مجلس منے خوشبوی مہکار
رہے عاشق ہو جو کوئی اوسکوں کھاوے
کرے جیو کوں مگن شولا مزعفر
کرے خوش پرورش جیو کوں مگن
دہرے لذت جـــدا ہر ہر نوالے
کہ پاوے اوستے داغ عشق کی بوی
چمن میں جیوں کھلے گلزار نرگس
مصالح دار کھچڑی عین نعمت
ادک تس میں پودینے کاج مہکار
رہے شکر لباں سوں مل کہ دایم
دیوے کس کوں دہیں کوئی چاشنی دار
سو مستاوا ہی ملغوبا پھٹانے
ادک سی جس منے بادام و شکر
سلونے کوفتیاں کا خاص لنواس[2]
جواں ہوجاتے اگر کھاوے اوسے پیر
ادک شرمندہ جس تے ماہ تابی
ادک سب کیے سری قلیہ فسنجں[5]
مسالا ہور نمک پانی موافق
جیسے کہیو کاج شروا[7] زعفران دار
مزہ جس کا کہے اللہ و اکبر
دہرے جس نے طبیعت حسن اخلاص
جتا کھاوے تو کم نا ہونے رغبت
کہ جس میں کہیو جوں پانی کے ریلے

---

۱ دلنا : کوٹنا　　۲ لنواس (کذا)　　۳ چنگی : اچھی اپنجابی)
۴ بھانت : قسم　　۵ فسنجن　　۶ چکوٹ　　۷ شروا : مشوربہ
۸ لوے (لہوے) ایک پرندہ : جس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔

سوا پالک میتھی[1] کا ساگ چوکا   پر ایک اوس کی ہوس کا ہوئے بھوکا
کتی پرکار کیاں چٹنیاں دلاویز   مزہ جس کا طبیعت کوں کرے تیز
کباباں بھانت بھانت نرم خوشبوی   کہ جس کی باس تے تازہ مغز ہوئے
قیمہ کے کباباں جیونکہ مسکا   چکھیا جن کوئی لگیاویں اوس کوں چسکا
جہانگیری کباب اوس تے ہی اعلا   حسینی کا مزا سب سوں نرالا
چکوٹ شامی کباب کباب اس بھات کے نرم   کہ جس کوں دیکھ ابریشم کرے شرم
نیمو مرچاں کی سیخاں نرم و نازک   زباں کی چاشنی کوں گرم چابک
سرس تکے کباب اعلا مہک دار   کہ جسکی باس اوٹھے مجلس میں مہکار
رکھے ویساچ لیا کے بھات پکوان   سموسے خاص ورقی سرخ بریان
مٹھیاں ساق عروساں مہر پرور   گلاب و مشک و عنبر سوں معطر
پوریاں کھاریاں سوالیاں ہور اندرسے   اچنبک قرص پھینیاں کے چندرسے
پری کم کی مصالح دار خوشبوی   جو موں بھر کھائے تو چٹکی سوں کم ہوئی
عجایب قرص گیور گیویں تر   لذت اوسکی کہوں تو آنے موں بھر
بڑاں لیاتے مٹھائی کے درختاں   جنت میں جیوں نصیب میں نیک بختاں
نبات ابلوچ کوں ساچے[2] منے ڈھال   انھے تس جھاڑ کے خوش پات ہور ڈال
الگانے تھے لڈو کے خوش جسے پھل   ثریا کھائے جس کوں دیکھ کر جھل
دھرے تس تل مٹھائی گنج در گنج   جو اوس کے لیا بہاریاں کوں چڑیا لنج
برے اوجلے ادک جیوں قرص چندر   دتے تھے جس کوں خالص مشک و عنبر
دسیں جرمے ستاریاں کے سرمکے[3]   مٹھے پیارے ادک جیوں لب پری کے
... و ادر بہشت جیوں جنت بہشتی   دھرے برفی کے انگھے برف رشتی
شکر پارے جسے شکر دوبارہ   کرے چندنیاں جسے گگن سوں نظارہ
اک حامیاں رلیمیاں پیچ در پیچ   جو کھاویں تو نچھے شربت بجز ہیچ
کدوری اس وضع کی جب سنواری   کٹے ہاتھاں لبے تب کھا نہارے

---

۱ میتھی : میتھی (ایک بھاجی کا نام)

۲ سانچا : مشین

۳ سرمکے ؟

کھانوں کی تفصیل

۱۔ پنجے کش ۲۔ گردی ۳۔ تافتان ۴۔ نان بادام ۵۔ نان ۶۔ باقر خانی ۷۔ کلیچے روغنی ۸۔ کماچاں ۹۔ زبان گاؤ ۱۰۔ چپاتیاں کاغذی ۱۱۔ تنکیاں حریری ۱۲۔ خمیری ۱۳۔ مانڈے ۱۴ شنگرفی ۱۵۔ ہری پولاؤ ۱۶۔ مزعفر ۱۷۔ یخنی پولاو ۱۸۔ مٹھا انبی پولاو ۱۹۔ قرماں پولاو (خرماں پولاو) دکنی اثر ۲۰۔ زیر بریاں ۲۱۔ قبولی ۲۲۔ یخنی کا شولا ۲۳۔ شولا مزعـــفر (شولہ) ۲۴۔ مطنجن ۲۵۔ خشکا سا مصالی (مسالا) ۲۶۔ خشکۂ دودی ۲۷۔ شصت رنگا ۲۸۔ گیلاس پلاو ۲۹۔ مصالح دار کھچـــڑی ۳۰۔ دہی میں ڈبو کر سکھائی ہوئی مرچیاں ۳۱۔ ملائی ۳۲۔ آش ۳۳۔ بورانی ۳۴۔ دانے (مونگ پھلی کے کوٹ کر) ۳۵۔ مستاوا ؟ ۳۶۔ ملغوبا ۳۷۔ پھٹانے ۳۷۔ چکولیاں (خاص دکی چیز) چکھلی ۳۸۔ برنج دکھنی مصالح دار ۳۹۔ سلونے کوفتے ۴۰۔ لپیٹے کی کھیر ۴۱۔ گلابی فرنی ۴۲۔ سری قلیہ ۴۳۔ فسنجن ۴۴۔ سادہ قلیہ ۴۵۔ دم پخت ۴۶۔ قلیا چاشنی دار ۴۷۔ مرغیوں کا قلیا ۴۸۔ لوے ، تیتر اور بٹیروں کا قلیا ۴۹ قلیۂ بیگن ۵۰ چچونڈے ۵۱۔ ترائی ۵۲۔ کریلے ۵۳۔ پالک ۵۴۔ میتھی ۵۵۔ چوکا (کھٹا چوکا) ۵۶۔ کئی اقسام کی چٹنیاں ۵۷۔ قیمدی کباب ۵۸۔ جہانگیری کباب ۵۹۔ حسینی کباب ۶۰۔ شامی کباب ۶۱۔ تکے کباب ۶۲۔ ورقی سموسے ۶۳۔ ساق عروساں (گولائی دار مغزیات بھرے میٹھے سموسے ۶۴۔ پوریاں ۶۵۔ کھاریاں ۶۵۔ سوالیاں ۶۶۔ اندرسے ۶۷۔ قرص پھینیاں ۶۸۔ پری کف ۶۹۔ قرص گیور ؟ ۷۰۔ مرقی ۷۱۔ شکر پارے ۷۲۔ زلیبیاں ۷۳۔ شربت

خوان نعمت کی تسخیر کا منظر

مہم پر قصد کیتی بادل ہمت   منگے تسخیر کرنے ملک و نعمت
اول میٹاں لیٹے یعنی نمکـــدان   چوڑانے بعد ازاں مانڈیاں کے میدان
ہزاں گڑ پر گئے ناناں کے لیتے   وہیں قلیے کے قصبے فتح کیتے
اٹے پکوان کے بازار سب لوٹ   سو ترکاری کے کھدلے منے کوٹ
بنم (؟) قاباں کے گڑھ[1] پر جیوں چلائے   سو وہانق گیسو کے سرو پھوڑ بھائے

۱ گڑھ : قلعہ

لگیا ڈوبنے کوں لشکر اشتہا کا — چلیا وہاں سوں نکل عالم ہوا کا
طبیعت جب لگی کرنے ملامت — کباباں سوں بندے کوچہ سلامت
بڑاں سرکے کے ساگر کی پکڑ باٹ — دہیں کے ریوڑی پیکی لے لاٹ
اچاراں کی ہولا کر بیدری[1] سب — گئے یکبار سلطانی ڈہوا تب
سو واں کفتیاں[2] کی گولیاں کا پڑا مار — چھوٹی یخنی کی ستوالی[3] ایکچ بار
چلے وہاتے جواناں تب نکل کر — پڑے خندق میں سنویاں کے پہل کر
لگے ڈوبنے کوں وہاں گہیو دود میں سب — شکر کے چور بالو[4] میں گئے دب
کتے فرنی کے دلدل میں گئے دہس — کتے چیکڑ میں صابونی کے گئے لہس
مشقت سات جیوں وہاتے نکل آئے — مٹھائی کی طرف سوں مورچا لائے
لگی گولی لڈو کی وہاں نے آے — نہنیاں گولیاں ہو یاں شکر پھولائے
بڑاں سب جمع ہوکر نیک بختاں — وہیں توڑے مٹھائی کے درختاں
میڑیاں در بہشت کیاں لاکر گئے چڑھ — سو جا لیتے وہیں ابلوچ کا گڑھ
بڑاں سب نعمتاں کے گڑھ چھوڑائے — مدد گاری سوں حق کی فتح پائے
ہوا سگلا مسخر ملک نعمت — لیا یک دہرتے سب کے جیو نے راحت
ہوئے محفوظ کھا کر نعمتاں خاص — کتے شکر خدا کا دل سوں باخلاص
جو کچ دل کو لگیا بھر پیٹ کھائے — رہیا باقی سو نفراں نے اوچائے
دہولائے بعد زاں پھول نیر[5] سوں ہات — ڈبے[6] پاناں کے لیائے اسی دہات
ہمیشہ یونچ دو نوشہ دو طرفا — کریں نت میزمانیاں غیر صرفا
مسلماناں کو جیوں کھانا کھلائے — سیدا[7] ویساچ بندواں کوں دلائے
دوکاناں لیا کہ مودیاں نے دے بھار — خبر جو کچھ منگیا دیتے اوسی لہار
مٹھایاں کے رکھے لیا کسح در کسح — لوٹاریاں کوں لیجاے تے چڑھیا لنج
چلے کیتک دن لگ یونچ چالے — رہیا نیں کوئی بشر نعمت سوں خالی

---

۱ بیدری : مرتبان ۲ کفتیاں ؟ ۳ ستوالی ؟
۴ بالو : باریک ریت ۵ پھول نیر : عرق گلاب
۶ ڈبے : ڈبّے
۷ سدا : شیدا آٹا ، بغیر پکا ہوا کھانا یعنی اناج

کھانے کی قسمیں

۱۔ مانڈاں ۲۔ ناناں ۳۔ کباباں ۴۔ دہیں ۵۔ ریوتی ؟ ٦۔ سینوہیاں ۷۔ گہیو (گھی) دود (دودھ) ۸۔ فـــرنی ۹۔ صـابونی (ایک قسم کی مٹھائی) ۱۰۔ لـــڈو (لـڈّو) ۱۱۔ شکر پھوٹانے ۱۲۔ مٹھائی کے درخت ۱۳۔ ابلوج (مصری) ۱۴۔ پاان (پان کی جمع) تنبول ۱۵۔ میزمانیاں . ضیافتیں (میزبانی) عام بول چال میں «مجوانی»

۱۷ مثنوی پنجۂ آفتاب از مذنب

کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی فہرست میں مولوی نصـــیر الـدین ہاشمی مذنب کی مثنوی «پنجۂ آفتـاب» کی بابت رقمطراز ہیں کہ «مذنب کے نام سے ہم واقف نہیں. یہ ارکاٹ کا شـاعـر تھا اور عمدۃ الامراء رئیس ارکاٹ ۱۲۱۰ تا ۱۲۱٦ ھ کے زمانے میں موجود تھـا. مذنب نے اپنی تنخواہ میں اضـافہ ہونے اور ایک گھوڑا ملنے کی تمنـا میں اس مثنوی کو لکھا ہے. «مـدراس میں اردو» میں اس کا ذکر موجود ہے. یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جو «ظفرنامۂ عشق» یعنی «مہر و ماہ» منظوم دکھنی مصنفہ مظفر کے سلسلہ کی کڑی ہے اس مثنوی میں جو کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے جزئیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے. منگنی شادی کے رسـومـات، برات کی کیفیت وغیرہ امور میں بڑی تفصیل موجود ہے.»[1] اس مثنوی میں شادی کی ضیافت کی تفصیل درج ہے جس میں پچاس سے زیادہ الوان نعمت کا تـذکرہ ہے. مخطوطہ کا کاتب کم سواد ہے لہٰذا اس نے املا کی اکـــثر غلطیاں کی ہیں. اس میں دکھنی کھانوں یعنی بگھاری ہوئی کھچڑی، دہی کی مرچیوں اچار، پاپڑ، پورن پوریوں، مصالحہ دار کباب، بادنجان کا قلیہ، جلبی، لڈو، دودھ پیڑے اور بوندی (موتی چور) کا ذکر موجود ہے.

دہرے قاب اس پر ہے کھانے کے لا	تھے اقسام کے کھانے بے انتہا
تھا اخنی پلاؤ اور بریـاں پلاؤ	اور نرگس پلاؤ، امیر خانی پلاؤ

---

۱ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات، جلد اول، مخطوطہ نمبر ۴۵۵ اور ۳۱۵ ص ۱۲۰ ۔ ۱۲۲ از مولوی نصیر الدین ہاشمی

بھی کندن پلاؤ چینی پلاؤ
اور دم پخته خاصه اور خرمی پلاؤ

اور ہے گوشت با گوشت شیریں پلاؤ
اناناس پلاؤ اور رسمی پلاؤ

ہے کھانے کے چانول اور گی[۲] گوشت کا
بیان وار کہتا ہوں جو ہے سو سنا

جو کھا زعفران دود دیق ہے گائے
یہ کہتے ہیں اوس دود سے ہے پکائے

وہ گایوں کا مسکے کا گھی نکال کر
پلاؤ نمیں ڈالے ہیں خوب وہ تر

جو بکرے کے چر چر پلے زعفران
اونو کا جو تھا گوشت سب ایکسان

[تھا میٹھا متنجن ، امیر خانی بھی
مظفر پلاؤ اور عباسی بھی]

تھا شعلہ[۱] مظفر جو مزے کا بنا
اور فرنی وہ فالودہ بیحد دہرا

دہرا بہت کچھ حریرہ و حلیم
ہر ایک کھانے سو جو ہے رسم قدیم

ہر ایک دل کے تہی اٹھے کھیچر لائی
آیا ہی بگاری ہوئی کھیچر لائی

اچار ہور پاپڑ ہری مرچیاں
ہر ایک چٹنی تھی پیاز اور مولیاں

پرائے سموسے پورن پوریاں
اور گاؤ دیدہ بہتر تھے گاؤ زبان

بہت خاصے خاصی جو تھی شیر مال
چپاتیاں تھی اور رولیاں بے خیال

اور سیخاں لگا کر بھونے بے حساب
مزے داری کے تھے شامی کباب

اور خشک اور تھے مصالح دار کباب
دیسے کباب ایسے کے لا انتخاب

بادنجانی قلیه و قورما تھا بھلا
دو پیازہ تھا مری کا خاصه دہرا

جہا(ں) تک جہا(ں) کی ہے ترکاریاں
وہا(ں) تک کے حاضر جو دیکھوں وہاں

اور میٹھا ، مٹھائی ملیدہ اور کھیر
اور دود دہیں اور تلک پنیر

جیتے طرح کے ہولو تو میوہ جات
حلبی و لڈو بہت تحفه جات

سہن حلوا اور حب کا حلوا تھا
اور بادام کا حلوا تھا با مزا

اندرسے دود پیڑے اور بوندیاں
جہاں کے تھے نعمتاں حاضر وہاں

نوٹ :۔ اس مخطوطے کا کاتب کم سواد ہے ۔ املا کی بے شمار غلطیاں ہیں ۔

الوان نعمت کی تفصیل

---

۱ گھی
۲ شوله

۱۔ اخنی پلاؤ (یخنی) ۲۔ بریاں پلاؤ ۳۔ نرگس پلاؤ ۴۔ امیر خانی پلاؤ ۵۔ کندن ۶۔ چینی پلاؤ ۷۔ دم پخت ۸۔ خسروی پلاؤ ۹۔ بغیر گوشت کا پلاؤ ۱۰۔ گوشت کا پلاؤ ۱۱۔ شیریں پلاؤ ۱۲۔ اناناس پلاؤ ۱۳۔ رمق پلاؤ ۱۴۔ [گایوں کو زعفران کھلا کر دودھ نکالا گیا اور بکروں کو زعفران کھلا کر ذبح کیا گیا] ۱۵۔ شعلہ مظفر [شولہ مزعفر] ۱۶ ۔ فرنی ۱۷ ۔ فالودہ ۱۸ ۔ حریرہ ۱۹ ۔ حلیم ۲۰۔ بگھاری ہوئی کھچڑی ۲۱۔ اچار ، پاپڑ ، ہری مرچیاں ، چٹنی ، پیاز ، مولیاں ۲۲۔ پراٹھے (پراٹھے) ۲۳۔ سموسے ۲۴۔ پورن پوریاں ۲۵۔ گاؤ زباں ۲۶۔ شیر مال ، چپاتیاں ، رولیاں ۲۷۔ سیخ (سیخ کباب) ۲۸۔ شامی کباب ۲۹۔ خشک کباب ۳۰۔ مصالحہ دار کباب ۳۱۔ بادنجانی قلیہ ۳۲۔ قورما (قورمہ) ۳۳۔ دو پیازہ ۳۴۔ موق (میٹھی) کا خاصہ ۳۵۔ ملیدہ ۳۶۔ کھیر ۳۷۔ دود ۳۸۔ دہی ۳۹۔ پنیر ۴۰۔ جلیبی ۴۱۔ لڈو ۴۲۔ سوہن حلوا (سوہن حلوا) ۴۳۔ حب حلوا (حبشی حلوا) ۴۴۔ بادام کا حلوا ۴۵۔ اندرسہ ۴۶۔ دودھ پیڑی ۴۷۔ ونڈیاں

فارسی

مثنوی بہرام گور و بانوی حسن از حافظ شیخ محمد فاضل سورتی ۱۰۶۶ ھ۔

عہد شاہجہانی کی اس غیر معروف مثنوی کو راقم الحروف نے طویل مقدمے اور تصحیح متن کے ساتھ مرتب کرلیا ہے۔ راقم کو اس مثنوی کی ترتیب و تدوین پر ناگپور یونیورسٹی نے (۱۹۹۱ ع) میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس مثنوی کے دو مخطوطے دستیاب ہیں کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں ایک نسخہ موجود ہے۔ فاضل ایک انشاء نگار بھی تھے۔ متذکرہ بالا مثنوی کا دوسرا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ (لندن) کی تحویل میں ہے۔ بہرام گور سے متعلق دستیاب شدہ فارسی مثنویوں میں یہ پہلی مثنوی ہے جس کی پیروئن بانوی حسن ہے۔ حالانکہ اس مثنوی سے سولہ سال قبل امین گجراتی اور دولت شاہ دولت نے اسی موضوع سے متعلق ایک دکنی مثنوی ۱۰۵۰ ھ یادگار چھوڑی ہے راقم نے یہ مثنوی بھی مرتب کی ہے۔ چونکہ اس مثنوی کا تعلق دکنی مثنویوں سے ہے اس لئے اس کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

صد گونه طعام چیده بودند — از پر رنگی به دکان نمودند
از قسم پلاؤ زعفرانی — و از سرخ و سیه چنانکه دانی
کوکو و کباب چشم گریان — هم ماش پلاؤ زرد بریان
بغـــرا و حلیم و آش سـاده — هم شـــیر برنج برنهاده
کیپای چه نغز و کله پاچه — عالم بنظـارهٔ دست پـاچه
هم ساده پلاؤ کشمشی هم — باقی بهمه خداست اعلم
هم خشکه و آش چاشنی دار — دمپخت و متنجنه بخـــروار
شش رنگه و کوفته بسی گرم — صد نوع کباب نازک و نرم
بریان ماهی برشته مرغان — بوده تنکی، کماج و هم نان
میوه بهزار رنگ چیده — حلـــوا بهزار گونه دیـده
انگـــور، انار، آبی، انجیر — یکجای بهم چـو شکر و شـــیر
خوبـانی، سیب پسته بادام — شفتالوی خاص و گردکان عام
زردآلو، توت، کشمش آلو — هم فندق خشک و تازه نیکو
فالوده و فـــورنی و حـــلوا — در ذائقه همچو من و ســـلوا
موصوف و زلابی و نخود قـند — بسیـار بغیر ازین نخـودقند
شه را خاطر پرآنچه میخواست — میخورد بسی بغیر کم و کاست

۱- پلاؤ زعفرانی ۲- پلاؤ سرخ ۳- پلاؤ سیاه ۴- کوکو کباب ۵- کباب چشم گریان (نرگسی کباب) ٦- ماش پلاؤ ۷- زرد بریان ۸- بغرا (قیمه) حلیم: ایک کھانا (کھچڑا) جو اناج، گوشت اور مسالے ڈال کر بنایا جاتا ہے۔ ۱۰- آش ساده: ابلے ہوئے گوشت کا سوپ ۱۱- شـــیر برنج (چاول کی کھیر) کیپای چه: رولی ۱۳- کلـــه پاچه (ســـری پایه) ۱۴- ساده پلاؤ ۱۵- کشمشی پلاؤ ١٦- خشکه ۱۷- آش چاشنی دار ۱۸- دمپخت ۱۹- متنجنه ۲۰- شش رنگه ۲۱- کوفته ۲۲- صد نوع کباب (ســـو قسم کے کباب) ۲۳- بریان ماهی ۲۴- برشته مرغان ۲۵- تنکی کماج، نان . مختلف اقسام کی تندوری روٹیاں ۲٦- میوه ہا ۲۷- حلوا ہا (سوقسم کا) ۲۸- فالوده ۲۹- فورنی: حـــلوا ۳۰- موصوف (میصوف: ایک قسم کی مٹھائی)

۳۱- زلابی (جلبی) ۳۲- نخود قند : چنے کے آٹے کی مٹھائی ۳۳- ہر قسم کے خشک میوے۔

مثنوی بہرام و گل اندام از امین سبزواری[1]

اس مثنوی کے صرف دو مخطوطے دستیاب ہیں۔ ایک کتب خانۂ ملیک، تہران ایران کی زینت ہے اور دوسرا راقم الحروف کا مملوکہ ہے۔ اس مثنوی کے تفصیلی تعارف کے لئے دیکھئے راقم کی مرتبہ کردہ مثنوی بہرام و گل اندام از طبعی گولکنڈوی[2] دراصل طبعی کی مشہور مثنوی اسی کارنامہ کا جزوی ترجمہ ہے۔

بہر سو کردہ مطرب صورت آغاز
چو گل رخسار و قد چو سرو آزاد
چو سر خوش گشت شاہ از بادۂ ناب
بیاورند، ساغر ہای جلاب
بنو شیدند اول چون کہ شربت
بیاورد ند صد الوان نعمت
طبقہا جملگی سیمین زرکار
پُر از انگور و انجیر و بہ و نار
درون طشتہای سیم بےدرِ تیغ
کشیدہ کاردہا ترکان چو مریخ
درون طشتہا شفتالو و سیب
چو گوہر ہر دادہ زریں سیب را زیب
درون صحن چینی فلک فام
پر از شکل و نبات و مغز بادام

---

۱ مثنوی بہرام و گل اندام [مکتوبہ ۱۰۷۱ ھ] [فارسی] از امین سبزواری، مخطوطہ مملوکہ، راقم

۲ مثنوی بہرام و گل اندام از طبعی، زیر طبع اردو بیورو، دہلی۔

کلیچہ چون نمودی از طبق چہر
نکردی کس نگہ در ماہ و در مہر

مزعفر در طبق سیمین بمجلس
ہمیں و طعنہا بر شاخ نرگس

پر از شربت بہر جا ساغر زو
کہ عارش آمدی از حوض کوثر

دم سنبوسہا از دلربائی
شکستہ رونق مشک ختائی

درون صحن از حلوای یاقوت
کہ با خاتم نگینے بود یاقوت

بران کس را کہ دو در چین بود بامے
بہ پیشش صحن چینی بود جامے

بیرون بردند چندان نعمت شاہ
کہ اہل چین ہمی خوردند یک ماہ

چو فارغ گشت شاہ روم از حوان
بیاوردند خلعتہای الوان[1]

۱- متعدد میوہ ہائے خشک و تر ۲- کلیچہ : کلچہ : کلچا : ایک قسم کی میدے کی چھوٹی خمیری روٹی جو تنور میں پکائی جاتی ہے۔ ۳- مزعفر ۴- شربتہا ۵- سنبوسہا (سنبوسہ) ٦- حلوای یاقوت ۷- مختلف الوان نعمت ۸- حلوان (بڑے یا لیلے کا گوشت ، مادہ جانور کے پیٹ سے نکلے ہوئے بچے کا گوشت)

عہد آصف شاہی کے باورچی خانے :

آصفی حکومت کے شاہی مطبخ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی نصیر الدین

۱　مثنوی بہرام و گل اندام مکتوبہ ۱۱۷۰ ھ [فارسی] از امین سبزواری مخطوطہ ص ۹۳

ہاشمی رقمطراز ہیں کہ

"واضح ہو کہ آصف جاہ ثانی کا باورچی خانہ تین داروغوں کے تحت نواب انوار جنگ سے متعلق تھا۔ جو خلوت کے پہلو میں تھا۔ روزانہ ۱۲۰ خوان خاصہ کے تیار ہوتے تھے جو محل شاہی میں ارسال کئے جاتے۔ جو خاصہ تقسیم ہوتا اس کو سالم خاصہ، نصف خاصہ اور پاؤ خاصہ کہا جاتا۔ جو بلحاظِ مرتبہ اور اعزاز کے تقسیم ہوا کرتا۔۔۔ ہر ایک باورچی خانے میں کئی کئی باورچی، رکاب دار اور دوسرے ملازم مامور تھے اور رکابداروں کی تنخواہ بیش قرار تھی جو رات دن اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف اور منہمک رہا کرتے باورچی خانے سے جو خوان تقسیم ہوتے وہ ذائقہ دار کھانوں سے بھرے ہوتے تھے۔۔۔۔۔ عام طور پر شادی بیاہ کے موقعوں ضیافتوں کا طویل سلسلہ ہوتا تھا۔ یعنے منجے، ساچق، مہندی، عقد خوانی، چوتھی، ولیمہ، جمعگی کی تقریبات میں حسبِ حیثیت ضیافتیں ہوتی تھیں طویل دستر خوان بچھائے جاتے اور ہر شخص یا چار اشخاص کے سامنے لوازمات سلیقہ اور تکلف سے چنے جاتے۔ کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ دس پندرہ بلکہ بیس لوازمات ہوتے۔ مہمان نوازی دکھنی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ دستر خوان کے تیار ہونے پر اور کھانے کے لئے مہمانوں کو طلب ہاتھ دھلانے، پان سپاری تقسیم کرنے وغیرہ کا جو سلیقہ ہوتا اور انکساری کی جاتی وہ اپنی آپ نظیر تھی۔"[1]

فی زمانہ دکنی الوان نعمت کی طرف خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ فلک بوس، پنج ستارہ ہوٹلوں میں دکنی پکوانوں کے نام نظر آنے لگے ہیں۔ ان کھانوں کی مقبولیت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ بیرونی ممالک لندن، امریکہ

---

۱ دکنی اردو، مولوی نصیر الدین ہاشمی، مقالہ دکنی ادب کا تہذیبی پس منظر ص ۸۰، بمبئی ۱۹۸۷ع

دوہی وغیرہ میں بگھارے بیگن اور سالن کٹ کے شوقین انگلیاں چاٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حیدرآبادی ناشتہ یعنی کڑھی، اُڑد کی دال (اڑہر) بھجئے وغیرہ ہوٹلوں کی شان بڑھاتے ہیں۔ البتہ اب بھی کئی ایسے کئی لذیذ پکوان ہیں جنھیں پوری طرح متعارف نہیں کیا گیا ہے۔ ان کی ترکیبوں پر غور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اگر بے اعتنائی برتی گئی تو شاید یہ پکوان صرف کتابوں میں محفوظ رہیںگے۔ راقم کی محنت اور کوہ کنی کا صلہ یہی ہے کہ اس نے بساط بھر کوشش کرکے دکنی پکوانوں کو ہندوستان گیر شہرت دینے کی سعی کی ہے۔

غرض و غایت (تحقیقی جائزہ):

گذشتہ صفحات میں دکن اور گجرات کی معروف اور غیر معروف مثنویوں سے ایسے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جن میں انواع و اقسام کے پکوانوں کا محاسبہ کیا گیا ہے مختلف قسم کے کھانے ہماری بود و باش اور کلچر کا اٹوٹ حصہ ہیں یہ ہماری طرز معاشرت اور عادات و اطوار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ٹوپوگرافی (جغرافیائی نقطۂ نظر) کے لحاظ سے ہر خطہ کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں آب و ہوا پر بھی اس بات کا انحصار ہوتا ہے کہ پکوان کیسے بنائے جائیں ہندوستان کے شمال میں پکوانوں میں روغن کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اسقدر مرغن پکوان نہیں ہوتے۔ جن پکوانوں میں مرغن اشیا کی ضرورت ہوتی ہے ان کی مقدار بھی بلحاظ موسم رکھی جاتی ہے۔ سردیوں میں ان کی بہتات ہوتی ہے اور گرمیوں میں ان میں کمی آجاتی ہے ہر چیز غرض و غایت کی مناسبت سے رکھی جاتی ہے۔ جنوبی ہند کا ایک خطہ ایسا بھی ہے جہاں ہر چاول یا چاولوں سے بنے ہوئے پکوان نوش کئے جاتے ہیں۔ اُڑد کی دال اور ناریل کا علیحدہ علیحدہ طریقوں سے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ وسط دکن میں اور خصوصاً حیدرآباد میں آج بھی جو کھانے پکائے جاتے ہیں ان میں املی کا بیشتر استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف گجرات کے تمام پکوانوں میں گڑ یا شکر کا استعمال عام ہے۔ اس طرح یہ کھٹے اور میٹھے پکوان اپنی علاقائیت کے ترجمان ہیں۔ بہ الفاظ دیگر پکوان اپنے اپنے کلچر کا آئینہ دار ثابت ہوتے ہیں۔ پکوانوں

سے طبقاتی کشمکش کی بھی نمائندگی ہوتی ہے۔ ہر معاشرہ میں غریب اور امیر پائے جاتے ہیں لہذا مندرجہ بالا مثنویوں کے اقتباس صرف متمول اور اہل ثروت پکوانوں کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ ان میں بہت کم پکوان ایسے ہیں جو عام لوگوں کے یہاں سوائے شادی بیاہ اور عید، تہواروں کے موقعوں پر پکائے جاتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ پکوان عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ البتہ ان پکوانوں کے لوازمات فی زمانہ گرانبار ثابت ہوسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ زمانے کی کروٹ کے ساتھ اب ان پکوانوں کی طرف سے بے توجہی اور غفلت برتی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ میز و کرسی نے دستر خوان کے آداب اور فرش نشینی سے ہم کو کوسوں دور کردیا ہے۔ ہم صرف مغلائی پکوانوں اور چینی کھانوں سے آشنا ہیں۔ موجودہ مزاج نے چینی پکوانوں کو زیادہ اپنا لیا ہے اور ہم اپنی ہی تہذیب کے اثاثہ سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں۔ اسلام نے ہمیں کھانے پینے کے شائستہ آداب سے روشناس کرایا ہے۔ اسی کے زیر سایہ ہماری مطبخ داری اور سفرہ گستری کا فن پروان چڑھا ہے۔ اسی کے ذریعے ہم کو مساوات کی تعلیم دی گئی ہے۔ گویا دستر خوان بھی طرزِ حیات اور باضابطہ زندگی کی درسگاہ ہے۔ ہاتھ دھلانے سے لیکر ضیافت کے اختتام تک میزبان کو جن ضابطوں سے گزرنا پڑتا ہے دراصل وہی اس کے کامیابی کی کسوٹی ابھرتی ہے۔ ساتھ ہی مہمان کو دسترخوان کے آداب کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ دستر خوان پر نشست و برخاست کے طریقوں سے اسے آشنا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ نہایت نفاست سے چنے گئے پکوانوں کو یکے بعد دیگرے نوش کرنے کا بھی ایک خاص طریقہ ہوتا ہے غیر مسلموں کے یہاں دستر خوان نہیں ہوتا بلکہ تھال یا کیلے کے پتے پر کھانا مروجہ طریقہ پر کھلایا جاتا ہے۔ یہاں پر مہمان کو اپنی رکابی میں کھانا خود نہیں لینا پڑتا بلکہ نوجوان لڑکیاں یا مرد کھانے پیش کرتے ہیں۔ اس لئے مہان کو صرف کھانے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ہمارے دستر خوانوں پر کھانا چنا ہوا ہوتا ہے۔ مہمان کو «دست خود دہان خود» سے کام لینا ہوتا ہے۔ کھانا پلیٹ میں لینے اور کھانے تک اسے کئی باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ مجلس کے آداب کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔ جب تک دستر خوان سے سارے مہمان ہاتھ نہیں اٹھالیتے اس وقت تک اٹھنے

کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ دور نے ہمارے اس قدیم ورثہ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ حیدرآباد کی ضیافتوں میں آج بھی حسب حیثیت پکوانوں کے ۵ تا ۷ یا اس سے زیادہ الوان نعمت دسترخوان پر چنے جاتے ہیں۔ مجلسی آداب سے بے بہرہ افراد ان پکوانوں کو صحیح ترتیب سے کھانے کے عادی نہیں ہیں راقم نے اسی غرض و غایت کے تحت یہ کوشش کی ہے کہ اسلامی تہذیب کے رو بزوال الوان نعمت سے قارئین کو کم از کم نام آشنا کرسکے۔ منظوم اقتباسات میں پکوانوں کے کئی نام ایسے آئیںگے جن سے ہمارے کان بھی آشنا نہیں ہیں شاید ہمارے بزرگ ان پر روشنی ڈال سکیں اور یہ اثاثہ طاق نسیاں کی زینت کے بجائے ہمارے دستر خوان سنوار دے مندرجہ بالا منظوم اقتباسات میں چند پلاؤ، کباب اور حلوؤں کے ایسے نام ملتے ہیں جس کے پکانے والے شاید اب باقی نہ ہوں۔ ہمارے لئے یہی کیا کم ہے کہ اب انکے نام ہی لذت و ذائقہ کے ضامن رہ گئے ہیں۔

مغربی تعلیم نے مشرقیت کو بلا شبہ روند ڈالا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی نوآبادیاتی تحریک نے مشرقی ملکوں کے مذاہب اور معاشرتی طریقوں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ہندوستان میں ایک سوچے سمجھے مشن کے ساتھ انگریزوں نے حکومت کی سیاسی سطح پر انہوں نے نفرت و تفریق کا بیج بویا۔ ہند المانی تہذیب اور ثقافت میں رخنہ اندازی کی۔ دھیرے دھیرے انگریزیت کے اثرات اتنے غالب آئے کہ ہماری قدیم تہذیب و معاشرت دھندلکے میں جا پڑی اور ہم اپنے ہی کلچر سے بیگانہ ہوگئے۔ لہذا اب ضرورت اس بات کی ہے از سر نو اقدار پارینہ کی شمع روشن کی جائے اور نئی نسل کو اس سے کم از کم روشناس کیا جائے۔ انہیں پشک، ساق عروساں، متنجن، مزعفر اور دمپخت جیسے ناموں سے متعارف کیا جائے۔ زیر بریاں، پلاؤ (پولاؤ - پُلاو) تہاری، قبولی، خشکہ، کھچڑی اور باقرخانی و نان میں فرق کی استعداد پیدا کی جائے۔ کباب چشم گریاں اور کوکو کباب کی لذت سے آشنا کیا جائے۔ برشتہ، نیم برشتہ اور خاگینہ کے فرق سے آگاہ کیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم Half fry تو پہچان سکیں اور نیم برشتہ سے سابقہ پڑنے پر بغلیں جھانکیں اور آئندہ مستقبل میں ہم کو صرف ہوٹلوں کے تختوں یا کھانوں کی فہرست (Menu) میں چھپے غلط نام یاد رہ جائیں اور ہم اپنی میراث کے قیمتی خزانے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھودیں۔

• • •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے تعلق سے
کچھ یادیں کچھ باتیں

از

ملک احمد قاسمی ، ایم اے ، ایل ایل بی
سابق رفیق، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی

پچھلے دنوں ایک مخصوص صورت حال کے پیش نظر انجمن اسلام جس طرح روز ناموں ، نشست گاہوں ، قہوہ خانوں اور عام بازاروں میں موضوع بحث بنا رہا وہ بہی خواہان انجمن کے لئے باعث تشویش بن گیا تھا ، خصوصاً ان افراد کے لئے جنکا کسی نہ کسی حیثیت سے انجمن یا انجمن کے تحت چلنے والے اداروں سے رابطہ رہا ہے ۔ چونکہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ، ادارہ کے ابتدائی دنوں میں بحیثیت « رفیق ادارہ » میری بھی وابستگی رہی ہے اہذا میرے لئے اس دردناک بحران سے متأثر ہونا ناگزیر تھا ۔ اس عالم تردد میں ادارہ سے متعلق نہ جانے کتنے نقوش ماضی کے دبیز پردوں کو چیرتے ہوئے باہر آئے ، کتنی یادیں تازہ ہوئیں ، کتنی صورتیں آنکھوں کے سامنے آگئیں ۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ اعزازی ڈائرکٹر اور نوائے ادب کے مدیر ڈاکٹر نظام الدین گوریکر ایک عرصہ سے مقتضی تھے کہ میں ان دنوں سے متعلق ، جب میں نے ادارہ میں سانس لی تھی ، اپنے تأثرات « نوائے ادب » کے لئے قلمبند کروں مگر میں ہر بار یہ کہکر کہ ایک تحقیقی رسالہ میں کسی غیر تحقیقی یا غیر تنقیدی مضمون کی شمولیت غیر موزوں رہیگی ، انکے تقاضے کو پورا کرنے سے پہلو تہی کرتا رہا اب کے ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کے دوران میں نے بھی محسوس کیا کہ چونکہ مضمون سے انسٹی ٹیوٹ کے ابتدائی ایام پر روشنی پڑیگی اس لئے ادارہ کے رسالہ میں شاید اس کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے اسی احساس کے تحت میں انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ اپنی یادوں کے خزانے کے کچھ حصے سپرد قرطاس کررہا ہوں ۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے پہلی بار میرا سابقہ اس وقت پڑا

جب میں نے ایم۔ اے کے طالبعلم کی حیثیت سے ۴۷ع میں ادارہ میں پہلا قدم رکھا۔ یہ نوزائیدہ ادارہ کا پہلا سال تھا۔ اس وقت انجمن کے احاطہ میں غالباً دو ہی عمارتیں تھیں۔ ایک ہائی اسکول کی وہ جاذب نظر عمارت جو علمی، ثقافتی اور طرز تعمیر کے لحاظ سے عروس البلاد بمبئی میں ایک خاص مقام کی حامل تھی۔ دوسری عمارت تھی سبحانی ہاسٹل کی۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسکول کی عمارت کی دوسری منزل میں واقع تھا اور اس کی کل کائنات دو یا تین کمروں تک محدود تھی درمیانی کمرہ ڈائرکٹر کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا ایم اے کی کلاسیس کے لئے۔ کتب خانہ، کریمی لائبریری سے ملحقہ بالکنی میں تھا۔ شام کے وقت کریمی لائبریری کے ہال میں علمی و ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں گاہے گاہے غیر ادبی جلسے بھی ہوتے تھے جیسے ہمسایہ ٹائمس آف انڈیا کی مزدور یونین کے احتجاجی جلسے، جن میں مالکان کے خلاف باغیانہ تقریریں ہوتی تھیں ہم بالکنی سے نیچے کے ان مناظر کا دلچسپی کے ساتھ مشاہدہ کیا کرتے تھے۔

مرحوم نجیب اشرف ندوی جو کچھ عرصہ پیشتر ہی اسمٰعیل یوسف کالج سے اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے ادارہ کے پہلے ڈائرکٹر تھے۔ موصوف سے بحیثیت شاگرد میرے مراسم کالج کے زمانہ سے ہی تھے۔ سابقہ تجربہ کی بنا پر انہوں نے مجھے ادارہ کی فیلوشپ کی پیش کش کی جسے میں نے بخوشی قبول کرلیا۔ رفیق ادارہ کی حیثیت سے میرے ذمہ اردو میں مستعمل دکھنی الفاظ کی تالیف کا کام تھا ندوی صاحب کے زیر ہدایت میں نے دکھنی کی نثری و شعری تصانیف کا مطالعہ کرکے اس قبیل کے الفاظ چن کر خاصی تعداد میں کارڈز بنائے تھے لیکن کچھ مزید کارڈز بناکر جملہ کارڈز کو کتابی صورت میں مرتب کرنے سے پہلے ہی میری خدمات کسی دوسرے کام کی جانب منتقل ہوگئیں جس کی تکمیل ادارہ نے اپنے ذمہ لی تھی۔ یہ کام تھا ہندوستانی کی ایک بنیادی لغت کی تدوین کا۔ دکھنی الفاظ کے کارڈز ایک الماری میں محفوظ تھے۔ پتہ نہیں ان کا کیا حشر ہوا۔

ہندوستانی کی جس بنیادی لغت کا ذکر ہوا ہے اس کا منصوبہ انجمن نے نہیں

بلکہ ہندوستانی پرچار سبھا وردھا نے بنایا تھا لیکن اس نے عملی صورت اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اختیار کی۔ کسی ادارہ کے ساتھ انجمن کا یہ غالباً پہلا اشتراک تھا۔ اور یہ باہمی تعاون کافی خوشگوار رہا یہاں مذکورہ پروجیکٹ کے پس نظر پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری تصور کرتا ہوں۔ ہندوستان کے مرکزی لسانی مسئلہ اور بالخصوص ہندی اردو تنازعہ کے پس منظر میں گاندھی جی نے 'ہندوستانی' کی صورت میں میانہ روی کا ایک راستہ سجھایا تھا۔ ھندوستانی سے مراد ایک ایسی مخلوط زبان تھی جو عربی فارسی اور سنسکرت کے دقیق الفاظ سے معرا ہو اور فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے۔ اس نظریہ کی پیروی میں ہندوستانی پرچار سبھا وردھا نے ایسی ہی زبان کی ایک بنیادی لغت مرتب کرنے کا لائحہ عمل بنایا تھا۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سر انجام پایا ہوا کام اسی لائحہ عمل کی ایک کڑی تھا۔ پرچار سبھا نے کئی ہزار کارڈز چھپوائے تھے جن میں اسوقت دستور ہند میں شامل چودہ زبانوں کے نام درج تھے۔ منشاء یہ تھا کہ مختلف زبانوں کے مروج ہم معنی الفاظ اکٹھا کرکے انکی بنیاد پر ایک قابل قبول بنیادی لغت مرتب کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مروجہ مترادفات کا معتدبہ ذخیرہ ہندی اور اردو سے ہی اخذ کیا جاسکتا تھا۔ اور یہی کام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سپرد تھا۔ منصوبہ کی تکمیل کے لئے کاکا صاحب کالیلکر کی نگرانی میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی تھی جو پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم دار، مولانا شہاب مالیر کوٹلوی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی پر مشتمل تھی۔ اردو ہندی اور انگریزی لغات کی چھان بین اور الفاظ کا انتخاب میرے اور ایک ہندی اور سنسکرت کے عالم واسو دیوآنند شاستری کے ذمہ تھا۔ کمیٹی کے اراکین وقتاً فوقتاً کام کا جائزہ لینے کی غـــرض سے یکجا ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا جس کے اختتام پر تیار شدہ کارڈز ہندوستانی پرچار سبھا کے کارکنان وردھا لے گئے۔ وہ کس مصرف میں آئے اور مجوزہ لغت کی تدوین کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا یا نہیں اس کا علم نہیں۔

پرچار سبھا کے کام کی تکمیل کے بعد اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے اگرچہ براہ راست میرا رابطہ نہ رہا مگر یہ رابطہ یکسر منقطع بھی نہیں ہوا۔ ان دنوں میرا

قیام سبحانی ہوسٹل میں تھا اور اس توسط سے کافی وقت انسٹی ٹیوٹ میں گزرتا تھا۔ ۱۹۵۰ ع میں انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی «نوائے ادب» کا اجراء ہوچکا تھا۔ میں ابتداء سے ہی اس سہ ماہی جرنل سے منسلک رہا۔ ان دنوں میں غالباً احمد ملک کے نام سے اخبارات اور رسائل میں مضامین اور نظمیں لکھا کرتا تھا۔ «نوائے ادب» سے وابستگی کی ڈور کب ٹوٹی یاد نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے دوران ہی میں نے بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وکالت کی سند کا امتحان دیا۔ یہیں میری ملاقات برٹش سٹیج ڈائرکٹر ہربرٹ مارشل سے ہوئی جو ڈاکٹر ملک راج آنند کے تعاون سے اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ پر فلم بنانے کی غرض سے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے ایما پر ان کے لئے امانت کے منظوم ڈرامہ «اندر سبھا» کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس کی بناء پر میرے ان سے اور ان کی سنگ تراش اہلیہ فریڈا برلنٹ سے بے تکلفانہ مراسم رہے۔ مارشل صاحب نے «ماہیے ســــوک تھیٹر» کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی جس کے صــــدر سیاسی رہنما ایس۔ کے۔ پاٹل تھے مجھے اس انجمن کی ادبی کمیٹی پر نامزد کیا گیا تھا۔ انجمن کا مقصد شیکسپیر اور برنارڈشا کے مقبول ڈراموں کو ہندوستانی میں ڈھال کر پیش کرنا تھا یہ تحریک کچھ زیادہ پروان نہیں چڑھی۔ انسٹی ٹیوٹ ہی میں انجمن کے اکاؤنٹنٹ علوی صاحب کے توسط سے میری ملاقات مشہور مصور حسین صاحب سے ہوئی۔ جنہوں نے میرے لئے ایک امریکن اشتہارساز کمپنی میں ملازمت کے لئے کوشش کی جو سعی ناکام ثابت ہوئی۔ انسٹی ٹیوٹ کے زمانہ میں ہی میری مسز ہیرن کیپٹن سے شناسائی ہوئی جن کی بدولت پنڈت جواہرلال نہرو سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

ان دنوں کا ایک اہم واقعہ ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی صاحب سے میرا تعارف تھا کیفی صاحب ان دنوں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرس کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھے اور اسی سلسلہ میں ندوی صاحب سے ملنے آئے تھے۔ ندوی صاحب کو ترقی پسند تحریک سے میری گہری دلچسپی کا علم تھا۔ انہوں نے کیفی

صاحب کو مجھ سے ملوایا اور ہم بہت جلد گھل مل گئے کانفرس کے لئے جگہ کی تلاش میں ہم پہلے بسین اور پھر بھیونڈی گئے . مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بھیونڈی کے رئیس ہائی اسکول کا احاطہ کانفرنس کے لئے تجویز ہوا . کانفرنس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کی لیکن کثرت اردو ادیبوں کی رہی . ان میں ملک کے نامور نقاد تھے ، شاعر تھے ، افسانہ نگار تھے . چوٹی کے ادیبوں کا اتنا بڑا اجتماع ایک خواب سا لگتا تھا . کانفرنس بے حد کامیاب رہی مگر اسکے نتائج اردو ادب کے لئے دور رس اور نامساعد ثابت ہوئے کیونکہ اسکی روداد اور قرار دادیں پڑھکر حکومت نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دیا جس سے اسکا شیرازہ منتشر ہوگیا اس انتشار سے تخلیق ادب کو ناقابل تلافی نقصان ہوا .

اسٹی ٹیوٹ سے ہی میری تلاش روزگار کی ابتداء ہوئی . جب کافی تگ و دو کے بعد علمی و ادبی اداروں کے دروازے بند پائے تو یونین پبلک سروس کمیشن کا ایک اشتہار امید کی کرن بنکر نمودار ہوا . یہ اشتہار براہ راست انکم ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے تقرر کے لئے تھا . معاشی مجبوریوں کے تحت میں نے نا دل نا خواستہ ایک غیر ادبی محکمہ کے لئے اپنا عریضہ داخل کیا اور میں انکم ٹیکس آفیسر کے عہدہ کے لئے منتخب ہوگیا یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک بات کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں جس سے ہمارے نوجوانوں کے یاس زدہ اور منفی خیالات کے شکار ذہنوں میں شاید امید کی کرن جاگ اٹھے بد قسمتی سے ہماری قسوم کے نوجوانوں کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا ہے یا انہیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ مقابلوں کے امتحانوں میں انکا انتخاب نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور اسی کے زیر اثر وہ ان مقابلوں میں شرکت کی جسارت نہیں کرتے . مجھ سے بھی احباب نے یہی کہا تھا . لیکن میری خود اعتمادی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی . اور یہ اعتماد بے جا بھی نہیں نکلا . محکمۂ انکم ٹیکس میں میرے افسران اعلیٰ ہمیشہ غیر مسلم رہے لیکن میں نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ مذہب کی بناء پر مجھ سے امتیاز برتا جا رہا ہے . میں ہمیشہ مخصوص عہدوں پر فائز رہا اور بہت کم مجھے تبادلہ کا سامنا کرنا پڑا . نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان بھر کے ہزاروں افسروں میں سے جو

افسر کامن ویلتھ فنڈ فار ٹیکنیکل کوآپریشن، لندن کی جانب سے مشرقی افریقہ میں کار گزاری کے لئے چنے گئے تھے ان میں میرا نام بھی تھا۔ اس بیان سے خود ستائی مقصود نہیں بلکہ غلط اندیش نوجوانوں کے سامنے حقیقت کا ایک صحیح رخ پیش کرنا ہے۔ صلاحیت، خـــلوص، دیانتداری اور جانفشانی کبھی نہ کبھی اپنا لوہا منواکر ہی رہتی ہے۔

بقول جگر مراد آبادی

صداقت ہوتو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ!
حقیقت خـــود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

عکمۂ انکم ٹیکس میں شمولیت کے بعد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں میری آمد و رفت کم ہوگئی اور ۱۹۶۶ع سے میرے ہونا تبادلہ کے بعد یہ سلسلہ بالکل ہی منقطع ہوگیا۔ انقطاع تعلق نہ صرف انسٹی ٹیوٹ بلکہ ساری علمی و ادبی دنیا سے تھا۔ تبادلہ کے کچھ سال بعد جب میں نیروبی روانہ ہونے کی غرض سے بمبئی آیا تو انسٹی ٹیوٹ ایک نئی عمارت میں منتقل ہوچکا تھا۔ ع ہم میکدہ سے نکلے تو دنیا بدل گئی۔ جب میں اشتیاق بھرے دل کے ساتھ وہاں پہنچا تو ایک مخصوص ماحول کی عادی آنکھوں کو ہر چیز نئی سی لگی سوائے کتابوں کے عنوانات کے بے اختیار منہ سے نکلا۔ اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے۔

«یاران انجمن» میں سر فہرست پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا نام ہے۔ ویسے تو وہ، پروفیسر دار اور مولانا شہاب مالیرکوٹلوی میرے بزرگ تھے مگر انسٹی ٹیوٹ میں ان کے ساتھ کافی بے تکلفی ہوگئی تھی اس لئے میں ان بزرگوں کو «زمرۂ یاران» میں شامل کرنے کی گستاخی کر رہا ہوں۔ ندوی صاحب سے میرا تعارف ۱۹۴۱ ع کے جون میں ہوا جب اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری میں میرا داخلہ ہوا تھا۔ تب سے لیکر انکی زندگی کے آخری ایام یعنی تقریباً پچیس سال تک انکے ساتھ برابر تعلق قائم رہا آج جب میں اپنا مجموعۂ کلام ترتیب دے رہا ہوں مجھے ان کی رہنمائی اور گہری ناقدانہ نظر کی بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ پچیس سالہ مراسم

کے پس منظر میں مجموعہ کے دیباچے کے لئے ان سے بڑھکر کون موزوں ہوسکتا تھا۔ ندوی صاحب کی رہائش گاہ مضافات بمبئی میں جوہو کے قریب ایرلا نامی ایک جگہ پر تھی۔ بمبئی کے بیابان سنگ و آہن میں آج اس جگہ کی شناخت بھی دشوار ہوگی۔ یہ رہائش گاہ بمبئی میں وارد اکابر کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ وہاں اکثر کسی نہ کسی نامور شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی ملاقاتوں میں پنڈت سندر لال سے ایک ملاقات تھی۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے مجھے الہ آباد آنے کی دعوت دی جہاں پنڈت نہرو کے ایما پر وہ ایک لغت کا خاکہ بنا رہے تھے۔ یہ "چینی ہندی بھائی بھائی" کا دور تھا اور سندر لال جی "انڈو چائنا فرینڈ شپ اسوسیشن" کے صدر تھے۔ اس ناتے انہوں نے میرے سامنے دوسری تجویز پیکنگ یونیورسٹی میں بحیثیت اردو پروفیسر جانے کی رکھی۔ لیکن میں نے نہایت انکساری کے ساتھ دونوں تجویزوں سے معذرت چاہی کیونکہ ان کی حیثیت عارضی تھی اور میں کچھ خانگی مجبوریوں کی بناء پر سیلانی زندگی کو خیرباد کہنے کی فکر میں تھا۔ میرے وضاحت کرنے پر انہوں نے بھی اتفاق رائے کا اظہار کیا۔

تاریخ و ادب میں ندوی صاحب کی علمیت مسلم تھی۔ انکی ناقدانہ نظر بڑی گہری اور تیز تھی۔ حاضر جوابی میں ان کا ثانی ملنا مشکل تھا مولانا شبلی نعمانی اور عطیہ فیضی کے مراسم کے بارے میں جو افسانے مشہور ہوئے تھے کچھ حضرات انہیں ندوی صاحب سے منسوب کرتے تھے۔ افسوس کہ میں نے ان سے اسکی تصدیق نہیں کرائی۔ ندوی صاحب کی زندگی کا یہ ایک بڑا المیہ تھا کہ وہ کسی نا معلوم وجہ سے بمبئی آکر ذہنی تساہل کا شکار ہوگئے جسکی وجہ سے انکی صلاحتیں دب کر رہ گئیں۔ انکی جسمانی موت اس صدی کی چوتھی دہائی میں بمبئی میں ہوئی لیکن اس سے بہت پہلے یہیں ان کی ادبی موت واقع ہوچکی تھی۔

پروفیسر محمد ابراہیم دار اسماعیل کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ نہایت سنجیدہ اور شرمیلے قسم کے انسان تھے۔ ان کے تبحر علمی کے سبھی قائل تھے۔ ان کی ہنسی مشکل سے خندۂ زیر لب کی حدود عبور کرتی تھی۔ انکساری ان کا خاص جوہر تھا۔ ان کے تعلق سے ایک بات یاد آتی ہے جس کی تفصیل سے شاید

اردو ادب کے طلباء استفادہ کرسکیں۔ ہم دونوں کے درمیان اقبال کی مشہور نظم "فرمان خدا - فرشتوں سے" زیر بحث تھی۔ جب درج ذیل شعر پر پہنچے۔

حق را بسجو دے، صنماں را بطوافے   بہتر ہے چراغ حـــرم و دیر بجھادو

تو دار صاحب نے بے ساختہ سوال کیا کہ کیا پہلے مصرعے میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہورہی ہے؟ حق را بسجودے، صنماں را بطوافے۔ کیا؟ میں نے یہ شعر بارہا پڑھا اور دوہرایا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا مقصد بھی واضح تھا۔ مگر اس میں کسی لفظ کے فقدان کی طرف کبھی میری توجہ نہیں گئی تھی۔ مجھے سالوں تک اس کی کرید رہی لیکن کہیں اس کا تشفی بخش جـــواب نہیں ملا تاآنکہ ایک پاکستانی محقق سے ایک دن ملاقات ہوئی انہوں نے چشم زدن میں میری الجھن دور کردی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ پہلے مصرع میں لفظ "فریبند" رہ گیا ہے۔ اقبال نے یہ مصرع فارسی کے حسب ذیل شعر سے اخذ کیا ہے۔

زنہار ازیں فـــرقہ مباشی کہ فریبند   حق را بسجودے، صنماں را بطوافے

دار صاحب کے سوال کا جواب مل گیا مگر کافی دیر ہوگئی تھی۔ دار صاحب رخت سفر باندھکر راہی ملک عدم ہوچکے تھے۔

جس وقت میں پہلی بار مولانا شہاب مالیر کوٹلوی سے ملا ان کی عمر غالباً اسّی سے تجاوز کرچکی تھی۔ مگر دل ابھی تک جوان تھا۔ وہ بڑے زندہ دل، آزاد طبع اور وسیع الخیال انسان تھے علم و ادب اور مذہبیات سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ انکی زندگی تجربات میں گزری تھی۔ غالب پر فدا تھے۔ شعر لہرا لہرا کر پڑھتے تھے اس انداز سے جیسے اسکی روح ان میں سرایت کر گئی ہو ایک بار جب ہم سرشام انجمن کی عمارت سے باہر نکلے تو سامنے وی - ٹی - اسٹیشن کے گنبد پر پندرھویں کا چاند پورے جاہ و جلال کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ شہاب صاحب یہ منظر دیکھکر مچل گئے اور بڑی دیر تک غالب کا مصرع دہراتے رہے۔

ع ایک نگار آتشیں رخ، سر کھلا

انسٹی ٹیوٹ کے پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی تھے۔ بڑے رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ ان کے ہر انداز سے ریاست کی بو آتی تھی۔ کچھ ہی دنوں پہلے ان کی تصنیف ولی گجراتی، منصۂ شہود پر آئی تھی اور بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی وہ کچھ ہی عرصہ اپنے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کی جگہ اس وقت کے ابھرتے ہوئے ترقی پسند نقاد ممتاز حسین نے لی۔ دلچسپ آدمی تھے۔ ان کے ساتھ ہنسی مذاق کا سلسلہ رہتا تھا جس میں کبھی کبھار مرحوم ط۔ انصاری بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ممتاز حسین بھی تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوکر پاکستان روانہ ہوگئے۔

انسٹی ٹیوٹ کے پہلے لائبریرین فصل اللہ فاروقی صاحب تھے۔ ان کا تعلق جونپور سے تھا۔ مرنجاں مرنج، خوش طبع اور باذوق شخصیت کے حامل تھے۔ عالموں اور ادیبوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اپنی خوش طبعی کی بناء پر بہت جلد ان کا حلقۂ احباب وسیع ہوگیا تھا۔ اقارب کے دباؤ میں آکر بیچاروں کو کراچی ہجرت کرنا پڑی۔ اس فیصلہ سے ان کے دل پر کیا گزری اس کا مجھے علم ہے۔ ان کی رخصت سے جو خلاء پیدا ہوا تھا اسے حامد اللہ ندوی صاحب نے پُر کیا۔ سنا ہے کہ وہ اب ڈاکٹریٹ کی دستار فضیلت باندھ کر کسی اور حیثیت سے پھر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہوگئے ہیں۔

جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے عبدالرزاق قریشی پہلے شخص تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی کام کرکے اسکے نتائج کتابی صورت میں پیش کئے ان کی تصانیف کے نام باقاعدگی سے «نوائے ادب» کے شماروں میں چھپتے رہتے ہیں۔ قریشی صاحب انجمن اسلام ہائی اسکول میں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کی ساری توجہ انہیں پر مرکوز رہتی تھی۔ اردو ادب سے انہیں ہمیشہ لگاؤ رہا اور انہوں نے نہایت انہماک و استغراق کے ساتھ تحقیقی کام سر انجام دیا۔ ہم میں کافی قربت تھی اور ہم دونوں اکثر باہم مشورے کیا کرتے تھے۔

گاہے گاہے انسٹی ٹیوٹ آنے والوں میں عبدالعلیم نامی بھی تھے جو ازا

دنوں اردو ڈراموں کی تاریخ و ارتقاء پر تحقیق کررہے تھے۔ ایک اور نام یاد آتا ہے۔ مجازی صاحب کا۔ غالباً لکھنوی تھے۔ زبان بگڑنے کے ڈر سے وہ میر صاحب کی طرح کانوں میں روئی نہ ٹھونستے ہوں مگر ہر دم بمبئی والوں کی اردو میں مین میخ نکالتے رہتے تھے۔ جب دیکھو کسی نہ کسی سے الجھے رہتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب نے اعلان کیا «کھانا کھانے جارہا ہوں»۔ سنتے ہی مجازی صاحب چراغ پا ہوگئے۔ کہنے لگے آپ کے جملہ میں «کھانا» فاضل ہے «کھانے جارہا ہوں» کافی ہے اور یہی صحیح اردو ہے۔ ان کی آمد ہمارے لئے دلبستگی کا باعث ہوتی تھی اور حضرات بھی تشریف لاتے تھے۔ پتہ نہیں ان میں سے کتنے بقید حیات ہیں۔ بہرحال جتنے بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں ان کے لئے زبان پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے۔

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو خیرباد کہے تقریباً چالیس سال ہوچکے ہیں لیکن آج بھی ذہن میں اس ادارہ میں بتائے ہوئے لمحوں کے نقوش تازہ ہیں امتداد زمانہ ان نقوش کو دھندلانے میں ناکام رہا ہے۔ آج بھی میں جب کبھی تاریک راتوں میں «داغ حسرت دل کے شمار» میں مبتلا ہو جاتا ہوں تو انسٹی ٹیوٹ میں گزارے ہوئے ایام کی یادیں میری تنہائیوں میں جگنو بنکر روشنیاں گھولتی رہتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور انکے تعلیمی افکار و اعمال

از
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ڈائرکٹر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، بمبئی - ۱

تاریخ شاہد ہے کہ زمانہ میں جب ایک قوم اپنی طاقت کے بل بوتے پر دوسری قوم پر غالب آتی ہے تو مغلوب قوم کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے اور ذہنی طور پر مفلوج ہوجاتی ہے اور نتیجتاً وہ ایک قسم کے احساس کا شکار ہوجاتی ہے ۔ ان حالات میں علمائے دین اور دانشورانِ قوم میں ہیجان بپا ہوجاتا ہے اور ان میں دو گروہ پیدا ہوجاتے ہیں ایک گروہ قدیم روایات اور جدید میلانات میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا گروہ قدامت پرستی کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اقدار کو اپنانے کی خاطر ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے ۔

انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں کے برسر عروج آتے ہی انہوں نے اہالیانِ ہند کے دلوں میں نہ صرف شکوک و شبہات پیدا کئے بلکہ انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ذریعے ان کو ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے کی جرأت ہی نہیں بلکہ ہر ممکن تدابیر اختیار کیں اور مسلمانانِ ہند اپنی ماضی کی شاندار تاریخ کو حال کے ناگفتہ بہ حالات کے آئینہ میں مستقبل کو خوشگوار بنانے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فکرمند تھے ۔ لہٰذا رہنمایانِ ملت اور علمائے دین نے ایک طرف اور مشائخ کبار اور دانشورانِ قوم نے دوسری طرف اسلام کے قلعۂ روئین کو عیسائی مشنریوں اور آریہ پرچارکوں کے ناپاک ارادوں سے باز رکھنے کے لئے جد و جہد ہی نہیں کی بلکہ ایسا لائحہ عمل بنایا کہ جس کے سبب عیسائی تبلیغ کے ہتھکنڈوں اور آریہ تحریک کے حربوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے اور خصوصی طور پر نظام تعلیم کی طرف توجہ دی ع

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا

کیونکہ اٹھارویں صدی کی ایک اور خطرناک سازش بالفاظ دیگر انگریزی علوم اور سائنسی انکشافات کی چمک دمک نے مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کردیا اور یورپ میں احیاء العلوم کے پردہ میں مستشرقین نے علوم مشرقی کو اپنے مزاج کے مطابق مغربی زبانوں میں ترجمہ کرکے مسلمانانِ ہند کو تذبذب میں ڈال دیا تھا۔

سر سید احمد خان (۱۸۹۸ - ۱۸۱۷) جیسے دانائے قوم نے مولوی چراغ علی جیسے ہم مزاج اربابِ دانش کی معیت میں مغربیت سے متاثر ہوکر بقول حالی ع

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

انگریزی تعلیم اور مغربی نصابات پر زور دیا اور انگریزوں کی سرپرستی میں ۱۸۷۷ع میں محمڈن اورینٹل کالج جس نے ترقی کے مراحل طے کرکے ۱۹۱۱ع میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) کی شکل اختیار کی اور دوسری طرف علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) جیسے عالم دین نے مولوی محمد علی مونگیری جیسے ہم خیال اصحاب علم کی رفاقت میں مشرقی اقدار کے پیش نظر مذہبی احساس اور قومی اتحاد کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہوئے بقولِ ڈاکٹر اقبال ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی تعلیم کو بمقتضائے وقت نصابات میں شامل کرنے کی سعی مشکور کی اور آخرش ۱۸۹۴ع میں ندوۃ العلما کی نیو ڈالی جو بتدریج ترقی کرکے ۱۸۹۶ع میں دار العلوم (ندوہ) کے نام سے ظہور پذیر ہوا۔ علاوہ ازیں جہاں سر سید نے غازی پور میں ۱۸۶۳ع میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرکے انگریزی کی مستند اور مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروایا وہاں علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں ۱۹۱۰ع میں دار المصنفین کی بنیاد رکھی اور مشرقی علوم کے سرمایہ کو اردو میں منتقل کرکے قوم و ملک کی زبردست خدمت انجام دی ہے جو ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

علامہ شبلی بیک وقت ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مورخ، ایک ناقد

ایک سوانح نگار، ایک محقق، ایک مفکر، ایک مصلح ہی نہیں بلکہ ایک ماہر تعلیم بھی تھے۔ دراصل وہ ایک ہمہ جہت انقلابی تھے اور انکی رنگا رنگی اور بوقلمونی انکی شخصیت کی غماز اور ان کی عظمت کی امین ہے۔ دوسرے لفظوں میں انکی شخصیت میں جو حقیقت ہے وہ فسوں بھی ہے، جو خواب ہے وہ تعبیر بھی، جو افسانہ ہے وہ زندگی بھی اور جو غبار ہے وہ آئینہ بھی۔ حقیقت میں ان کا شمار ان علمائے اسلام میں نہ تھا جن کا مشغلہ خانقاہوں میں رشد و ھدایت یا مکتبوں میں درس و تدریس رہا ہو بلکہ وہ عہدِ قدیم اور عصر جدید کے اربابِ دانش کی رفاقت سے بہرہ اندوز ہوئے اور اسی لئے انکے زندگی کی سرگذشت علمائے ماضی سے نسبتاً مختلف ہونے کے باوجود تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علامہ شبلی کی ذات سر سید کی طرح مسلمانوں کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں بہت بلند ہے۔ انھوں نے اپنی تقاریر اور اپنے مضامین میں اصلاح تعلیم پر اظہار خیال کیا ہے بلکہ اسلامی مکاتیب کے نصابِ تعلیم کے نقائص و معائب سے قوم کو آگاہ کیا اور تعلیمی امراض کے درماں کے طور پر علمائے اسلام میں زندگی اور مکاتیب عربی میں اصلاح کی ہے وہ ان کی مساعی مسلسل کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید کا طریقۂ کار نسبتاً آسان تھا کیونکہ ان کی دعوت وقت کی پکار تھی اور حکومت وقت بھی انکی معاون تھی لیکن علامہ شبلی کی تعلیمی تحریک کےلئے حالات ناسازگار اور حکومت بھی بدظن ہی نہیں بلکہ خوفزدہ تھی اور ساتھ ہی برادران وطن کی مخالفت کے علاوہ سماجی کارکنوں کا فقدان تھا ع

ہوا مخالف و شبِ تار و بحر طوفان خیز

علامہ شبلی نے اپنے علیگڑھ کے دوران قیام میں جب انگریزی خواں طبقہ کو مذہب سے بے بہرہ اور وسیع النظری اور بلند ہمتی میں تہی مایہ پایہ تو انہوں نے علما کی طرف توجہ مبذول کی مگر یہ طبقہ بھی قدامت پرستی کی وجہ سے بد دلی و افسردگی اور پستی و خواری کا شکار تھا لیکن ان کا یہ ایمان واثق تھا کہ علما ہی قوم کو قعر مذلت سے نکال کر بام ترقی پر لے جاسکتے ہیں اور

ماضی میں بھی مذہب کے سہارے قوم نے ترقی کے مراحل طے کئے ہیں اور آئندہ بھی مذہب کے ذریعے ہی ترقی کے راستے پر گامزن ہوسکتے ہیں۔ اور مذہب میں یہ صلاحیت پیدا کرنا علما ہی کا اولین فریضہ ہے پس انہوں نے علما کی غرض سے اول ندوۃ العلما کے نام سے ایک انجمن کے قیام کو عمل میں لایا اور معتدین علما کی باہمی چشمک اور فکری جمود کو دیکھ کر دار العلوم (ندوہ) کی تاسیس کی تاکہ اس کے ذریعے ایسے فعال اور قابل علما تیار ہوجائیں جو بدلتے ہوئے حالات میں قوم و ملک کے لئے مفید ہی ثابت نہ ہوں بلکہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج کے پرچارکوں کی طرح دار العلوم (ندوہ) کے فارغ التحصیل علما •مولویوں• کے روپ میں ملک کے طول و عرض کا دورہ کرکے اسلام کی انسان دوستی اور وطن پرستی کا پیام عام کرکے غیروں کے اعتراضات کے معقول جوابات دیکر مذہبی غلط فہمیوں کا ازالہ کرسکیں۔

ھندوستان کی سرزمین سے جہاں صنعانی اور علی متقی جیسے فقہا، بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ جیسے متکلمین، ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ جیسے مفکرین خسرو اور فیضی جیسے شعرا اور ابو الفضل اور آزاد بلگرامی جیسے مورخین پیدا ہوئے وہاں سن ستاون کے ہنگامہ خیز حالات میں علامہ شبلی جیسی ہمہ جہت علمی و ادبی شخصیت نے جنم لیا جو بیک وقت شاہ ولی اللہ، ملا محمود، ابوالفضل اور آزاد بلگرامی جیسے دانشوروں کی صلاحیتوں کا مجموعہ تھی۔ دنیائے اسلام اس وقت ایک عجیب انقلاب کے خطرناک دور سے گزر رہا تھا، قدیم و جدید نظامات علم و عمل باہم متصادم تھے اور جس طرح دوسری صدی ھجری کی ضروریات یونان و ایران کے تصادم کے نتیجہ میں برآمد ہوئیں اسی طرح انیسویں صدی عیسوی میں یوروپی انکشافات اور مغربی علوم کے تصادم سے نئے حالات ظہور پذیر ہوئے۔ جدید فلسفہ و ثقافت کا حملہ متواتر دنیائے اسلام کے اکناف و اطراف میں محسوس کیا جارہا تھا لاجرم، صدائے حق کے طور پر ہر گوشہ سے علمائے اسلام لبیک کہکر دوڑے ہر جگہ مصلحین آمادۂ پیکار ہوئے اور ہندوستان میں بھی صدائے اصلاح جس سرعت و تیزی اور بلند آہنگی و وسیع النظری کے ساتھ نمودار ہوئی غالباً ہندوستان کی اس تحریک تجدید کا مقابلہ دوسرے بلادِ اسلامیہ نہ کرسکے اور اس

دور اصلاح کا سہرا ہندوستان میں علامہ شبلیؒ کے سر تھا اگرچہ اس کارواں کے دیگر ارکان میں سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولانا عنایت رسول، ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی جیسے دانشوران قوم و رہنمایان ملت بھی تھے۔

علامہ شبلی نے جب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامیت سے دور اور تہی مایہ پایا تو مایوس ہوئے اور علمائے کرام کی طرف متوجہ ہوئے انکی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اگرچہ قدامت پرست ارباب علم و دانش نے سخت مخالفت کی تاہم وہ اپنی ڈگر سے نہیں ہٹے اور اسلامیت کی صحیح روح پھونکنے کی خاطر انھوں نے تمام مسلمانوں کے طبقوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے لا الہ الا اللہ یعنی کلمۂ توحید کو بنیاد قرار دیا اور قومیت کی اساس بھی اسی کو کہا کیونکہ "ان کے نزدیک نہ سیادت و مشیخت اور نہ عربیت و عجمیت اس کی اساس ہے بلکہ اسلام اور صرف اسلام ہے" یا بقول خود: "نہ شیعہ نہ سنی، نہ وہابی نہ حنفی فقط توحید ہے اساس اسلامی" اور ساتھ ہی ساتھ "اسلام" اور "علم" کو ایک سکہ کے دو رخ قرار دیتے ہیں اور مزید کہتے ہیں کہ "علم اسلام کا مایۂ خمیر ہے۔" لہٰذا مرور زمانہ کے ساتھ طریقۂ تعلیم، نصاب تعلیم اور درس تعلیم میں تبدیلی لانا ضروری و لازمی سمجھا کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ بنو امیہ کے عہد میں کتابی درس کا رواج نہیں تھا بلکہ زبانی درس ہی نظام تعلیم کی بنیاد تھی لیکن بنو عباسیہ میں زبانی کے ساتھ کتابی درس شامل نصاب کیا گیا۔ اور بتدریج بو علی سینا کی کتب مقبول ہوئیں بعینہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہر دور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں حتیٰ کہ ملا نظام الدین کے نام سے درس نظامیہ کہلاتا ہے اور آہستہ آہستہ ضروریات وقت کے پیش نظر ملا حسن غلام یحییٰ، حمد اللہ اور قاضی مبارک کی تصانیف نصابی کتب کا جزو لاینفک بن گئیں۔ پس ظاہر ہے کہ جس طرح زمانہ کے ساتھ نصابات بدلتے رہے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج سلسلۂ نظامیہ میں تبدیلی کیوں نہ لائی جائے۔

اگرچہ ١٩٠٣ع میں دار العلوم (ندوہ) کے معتمد تعلیم مقرر ہونے کے بعد علامہ شبلی کے لئے بظاہر اپنے حصول مقصد کے لئے راہ کھلی ہوئی تھی تاہم

مشکلات تھیں اور بہت زیادہ اور ایک خط میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

« اصلاح نصاب کا خیال صرف چند علما کے دل میں پیدا ہوا تھا باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چونکہ فیصلہ عموماً کثرت رائے سے ہوتا ہے اسی لئے انہیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں اسی قدیم نصاب کے تعلیمیافتہ ہیں اس لئے وہ جدید نصاب کے پڑھانے سے عاجز ہیں چونکہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے اس لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد پیدا نہیں ہوتی بہر حال یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کردیا جائے ۔ »

آخر میں مزید یہ لکھتے ہیں :

« اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرے تو سرے سے اصلاح نصاب کا نام لینا نہ چاہیئے ۔ یہ سخت بد دیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے ۔ »

علامہ شبلی عصر حاضرہ کے تقاضوں کے سبب انگریزی کو نصاب میں داخل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق « انگریزی کی تعلیم ہمارے طلبہ کے لئے از بس ضروری ہے ۔ اول انگریزی کی جانکاری کے سبب مغربی مستشرقین کے اسلام اور اس کی تاریخ پر اعتراضات سے واقف ہوں گے اور ان کے جوابات معقول طریقے پر بزبان انگریزی دے سکینگے ۔ دوم یہ کہ یورپ میں مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر برائے نام انگریزی سے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی ۔ »

ایک اور خط میں یوں رقم طراز ہیں ۔

« اور جب وہ درجہ تکمیل میں دو برس تک صرف انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی میں قابل گریجویٹوں کی برابری کرسکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغ اسلام کی خدمت کو انجام دے سکینگے ۔ »

علامہ شبلی کی یہ خواہش تھی کہ انگـــریزی داں طلبہ مسائل اسلام اور

تاریخ اسلام سے بقدر ضرورت واقف ہوں اور انہیں اس طرح مذہبی تعلیم دی جائے اور ان کی ایسی تربیت کی جائے کہ ان کے دلوں میں مذہب کی عظمت پیوست ہوجائے اور اس کی افادیت سے وہ واقف کار ہوجائیں۔

ایک مضمون بعنوان «تعلیم قدیم و جدید» میں فرماتے ہیں:

« یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی جذبات یعنی امامت، وعظ یا افتا کا کام لینا ہے بلکہ غرض یہ کہ وہ خود بقدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ اس کے لئے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلۂ کتب دینیات کی ضرورت ہے جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج اور دیگر کلاسوں تک کے قابل کتابیں ہوں »

اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں: «فقہ، عقائد و تاریخ اسلام۔»

اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

« لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے:

(الف) دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے،

(ب) مذہبی علماء بیش قرار مشاہرہ کے مقرر کئے جائیں،

(ج) وعظ کے موقعوں پر اکثر اور ارکان کالج تا امکان شریک ہوں،

(د) مذہبی پابندی کی بناء پر طلبہ کی خاص توقیر و تحسین کی جائے، اور

(ہ) سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گرانبہا وظائف دیکر ڈگری حاصل کرنے کے بعد مذہبی اعلیٰ تعلیم دلائی جائے »

اس ضمن میں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی

کے الفاظ میں «جس طرح اسوقت جدید علوم و فنون کے سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم بہ رہے ہیں ٹھیک اسی طرح ایک وقت ہماری قوم پر عباسیوں کے زمانہ میں بھی آیا ایکن ہماری قوم زندگی سے معمور تھی اس لئے انہوں نے اپنے مذہبی علوم کے ساتھ قدیم یونانی علوم کے بھی پہلو بہ پہلو جگہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر دو قسم کے علوم کے مابین ایک حدّ فاصل قائم ہوگئی۔ اس کے بعد ایک گروہ پیدا ہوا جس نے مذہب اور عقل کی تطبیق کی جس کے گل سرسبد امام غزالی تھے۔ بعینہ یہی کیفیت مذہب کی اس جدید تمدن کے دور میں ہوگئی ہے اور اس خرابی کو دور کرنے کی غرض سے ندوۃ العلما کی بنیاد ڈالی گئی ہے تا کہ ایسا تعلیم یافتہ طبقہ نمودار ہو جو مذہب اور عقل میں مطابقت پیدا کرسکے۔»

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکی نداند جام و سندان باختن

علامہ شبلی علمائے اسلام سے خطاب کرتے ہوئے انکی ذمہ داریوں کا انہیں احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دوسری قومیں بھی آج کے نامساعد حالات میں استقلال اور مضبوطی سے اپنے کام انجام دے رہی ہیں اور نئی تعلیم کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کو فراموش نہیں کررہی ہیں۔ اور جسطرح آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل نوجوان عیسائی «پادری» بن کر اپنے مذہب کی خاطر جنگل جنگل مارے مارے پھرتے ہیں تا کہ جنگلی قوموں کو «انجیل» سے آشنا کرسکیں۔ یا آریہ تحریک کے «پرچارک» اپنے «گروکل» قائم کرکے انگریزی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم لازمی قرار دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے ہندو مذہب کی اشاعت باقاعدگی سے کرسکیں یا پونہ کے مرہٹوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کی «انجمن خدام الهند» جس کے «رضا کار» اپنی زندگی کو قوم مرہٹہ کی خدمت کے لئے وقف کر رہے ہیں تا کہ آنے والی نسل ان کے نقش قدم پر چل کر اپنی مرہٹہ برادری کی خدمت کے لئے تیار ہو جائے لیکن بقول علامہ شبلی۔ «مسلمان اس معاملے میں سب سے پیچھے ہیں اور اسی لئے علما کو اسلامیت کی صحیح اسپرٹ سے آگاہ کرنے اور زندگی کے ہر شعبہ میں خدمت اور صحیح خدمت کرنے کی غرض سے «ندوۃ العلما»

کی نگرانی میں « دارالعلوم » کو قائم کیا گیا ہے جہاں فروعی معاملات کو اہمیت نہیں دی جائے گی تا کہ وہ اچھے « مولوی » کی حیثیت سے « اسلام » کے فروغ و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں »

مزید کہتے ہیں کہ « ندوۃ العلما » کا یہ « دارالعلوم » دراصل « جامعہ دینیہ » ہے جہاں تمام اسلامی علوم کے اعلیٰ درجہ تک پڑھانے کا اہتمام ہوگا ، جہاں سے اسلامی مؤلف اور مصنف پیدا ہوسکیں گے ، جہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہوگا اور جہاں کے جدید علم کلام کی روشنی میں پڑھے ہوئے فارغ التحصیل طلبہ میں انگریزی زبان میں وعظ و تقریر اسلام کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائیگی ۔ اس کا دوسرا مقصد « اشاعتِ اسلام » ہے تاکہ عیسائی « مشری » اور آریہ « پرچارک » کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے طلبہ « واعظ » یا « مولوی » کی صورت میں آمادہ ہوجائیں اور « اسلامیت » کے ساتھ « وطنیت » کا پیام عام کرنے میں ہمہ تن مصروف رہیں

علیٰ ہٰذا علامہ شبلی حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آج بعینہٖ اسی قسم کی حالات اور اسی قسم کا موقع ہے یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدلدیا ہے ، فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے ، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں ، معانی و بلاغت کا اصول بدل گیا ہے ، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے اور مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرائے نکل آئے ہیں تو کیا آج عقائد کو علمِ کلام کی صورت میں پیش نہیں کرسکتے ، عربیت کے ذریعے معانی و بلاغت کا قالب نہیں بدل سکتے ، اصولِ فقہ میں منطقی استدلات پیدا کر کے فلسفہ کی آمیزش نہیں کرسکتے ، فرائض میں علم کے دقیق اصول شامل نہیں کرسکتے ؟ تفسیر میں ان تمام امور کا حل نکل سکتا ہے بشرطیکہ علومِ قدیمہ کی غلامی کی صورت میں نہیں بلکہ آزاد و خود مختار بنکر کیجائے ۔ جہاں غلطیاں ہوں ان کی اصلاح کی جائے ، جو حصہ فضول ہو اس کو الگ کر دیا جائے جہاں پریشان اور غیر مرتب مسائل ہوں انہیں نئے سرے سے درست کیا جائے ، جو حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہوسکتا ہے اسے تحلیل کیا جائے اور جو جدا ہے اسکو

مستقل حیثیت سے قائم رکھا جائے۔ اور اس طرح ہم اپنے علوم و تمدن کو با وقار اور مغربی علوم کی ہمسری کے قابل بناسکتے ہیں۔

دراصل علامہ شبلی نے ایک طرف اردو کو اس قابل بنایا کہ وہ ہندوستان کی ایک علمی زبان بن کر دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار کی جانے لگی تو دوسری جانب انہوں نے نہ صرف اسلاف کے کارناموں کا جائزہ لیا بلکہ دولت عباسیہ کی علمی کارگذاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے دوسری زبانوں میں خصوصی طور پر یونانی، سریانی کلدانی، قبطی اور ہندی زبانوں سے عربی زبانوں میں تراجم کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ ضرورت وقت کے پیش نظر ایک تجویز پیش کی تا کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے دیگر اقوام میں اپنا با وقار مقام متعین کرسکے۔ اس ضمن میں «ندوۃ العلما» کے ایک اجلاس میں انہوں حکمائے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: «قوم کو ضرورت ہے اس بات کی کہ وہ

(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کے معتدبہ حصہ کو اردو میں منتقل کرے،

(۲) عقائد اسلام کو دلائل عقلی کی روشنی میں پیش کرے،

(۳) اسلامی علوم کی تدریجی ارتقا کی تاریخ کو از سر نو مرتب کرے،

(۴) عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا تجزیہ کرکے ان کے سرمایے کو تفصیل سے لکھے،

(۵) اکابر سلف کی سوانح عمریاں ترتیب دے اور ان کے انکشافات اور اجتہادات پر علمی بحث کرے،

(۶) عربی زبان کی نادر اور نایاب کتب پر تبصرے لکھوائے اور ان کی عظمت اور افادیت کو واضح کرے،

(۷) مغربی ممالک اور خصوصاً یورپ میں اسلام اور اس کی تاریخ کے تعلق سے جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کو ملکی زبان میں پیش کرے،

(۸) مسلمانوں کی ثقافت و معاشرت اور نظامت و عدالت پر مضامین لکھوائیے تاکہ ان کی خدمات کا محاسبہ ہوسکے اور

(۹) ادبیات اسلامی، مطبوعات جدیدہ، انتقادات متفرقہ، مباحث حاضرہ اور استفسارات علمیہ کے تحت مستشرقین کے عقلی، تاریخی، تمدنی، اخلاقی اور ادبی اعتراضوں کے معقول جوابات دئے اور اس طرح ان کی تلخی کو دور کرے۔

الغرض علامہ شبلی جنہوں نے سن اٹھارہ سو ستاون کی پہلی جنگ آزادی کے پُر آشوب حالات میں آنکھ کھولی اور سن انیس سو چودہ کی عالمی جنگ کے ہنگامہ خیز ماحول میں آخری سانس لی، حقیقت میں ایک ایسی یگانۂ روزگار ہستی ہے جس کی مثال گذشتہ ایک صدی میں تمام ممالک اسلامی میں بمشکل مل سکیگی اور جو آئندہ ہزاروں سال تک شبستانِ معاشرت و انسانیت کو چراغاں اور نوبت گاہ علم و ادب کو گلِ بداماں رکھے گی۔ دوسرے لفظوں میں علامہ شبلی نہ صرف معدنِ لعل و گوہر کے ایک انمول موتی، چمنستانِ علم و دانش کے گلِ تازہ آسمانِ فضل و کمال کے ایک درخشندہ ستارہ بلکہ ایک جہانِ معنی، ایک کائنات تحقیق، ایک دنیائے معلومات اور اس سے بڑھ کر وہ اردو کے ایک مینا بازار، فارسی کے ایک بلبلِ شیراز، تاریخ کے ایک معلم اول، الکلام کے ایک مجتہد زمانہ اور فلسفہ کے ایک امام وقت ہیں جنہوں نے اپنے دماغ و قلم سے جن راہوں پر بھی اپنے نقش قدم چھوڑے ہیں وہ مدتوں یاد رہیں گے ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

● ● ●

کتابی دنیا

تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ

مولفہ شایاں بریلوی

تبصرہ از

ڈاکٹر این۔ ایس۔ گوریکر

ادب پاروں کے پوشیدہ خزانوں کی تلاش اور معلوم حقائق کا عصری رجحانات اور معاشرتی حالات کی روشنی میں تجزیہ کرکے پیش کرنا تاریخ کا دوسرا نام ہے اور مسلسل جستجو کے ذریعے گم شدہ تخلیقات کی بازیافت اور اسکی قدر و قیمت دریافت کرنا اگرچہ قدرے مشکل ہے ناممکن نہیں۔ تاریخ میں تنقیدی اور تحقیقی پہلو دونوں نمایاں ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے اردو ادب اور اسکے مختلف اصناف کو تحقیق اور تنقید کی روشنی میں پیش نظر کیا جانے لگا ہے۔ بہرکیف، اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اردو میں تاریخ کی بنیاد نہ تحقیق کے جدید اصولوں پر تھی اور نہ اس کی حیثیت معاصرین کے سوانحی حالات کی ترتیب سے۔ دراصل دیگر اقسام ادب کی طرح اردو میں بھی تاریخ کے تجربات کی شروعات ہوچکی تھی اور شعرائے اردو کے تذکرے، بزبان فارسی اگرچہ نقد و تبصرے کے اعتبار سے ادبی اہمیت کے حامل ہیں مگر تاریخ و تحقیق کے لحاظ

سے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب «تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ» میں شایاں بریلوی (۱۹۲۸ - ۱۹۹۰) نے اپنی انتھک کوششوں سے نہ صرف مواد فراہم کرنے بلکہ ترتیب دینے میں اپنی قیمتی زندگی کے چالیس سال صرف کئے ہیں اور تہذیبی و تاریخی اور علمی و ادبی لحاظ سے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور لکھنؤ، دہلی، عظیم آباد اور دکن کی ادبی دبستانوں کی نہج پر روہیلکھنڈ کی علمی، ادبی، لسانی اور تہذیبی اہمیت اور افادیت کو واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور دستاویزی سطح پر پیش کرکے زبان و ادب کی بے مثال خدمت انجام دی ہے۔

سید تعظم علی نقوی متخلص شایاں بریلوی جنکے دادا خواہاں اور والد جویاں تخلص کرتے تھے، اپنے عہد کے ایک ممتاز شاعر و ادیب کے علاوہ صوفی منش بزرگ تھے۔ انہوں نے روہیلکھنڈ کے مشہور اضلاع میں بالخصوص بریلی، بدایوں، بجنور، رامپور، مراد آباد، شاہجہاں آباد اور پیلی بھیت کے متقدمین، متوسطین، اور متاخـــرین شعرا کے حالات ہی نہیں بلکہ انکے انتخاب کلام کی فراہمی میں اپنی لگن، دلچسپی اور خلوص کا بین ثبوت دیا ہے۔ یہ تذکرہ نہ تعارف نامہ کا کام انجام دیتا ہے بلکہ نقد و تبصرہ کے ساتھ ساتھ تاریخ و تحقیق کا آئینہ بھی ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جسے شایاں بریلوی نے چار جلدوں میں مواد کی دستیابی میں غیر معمولی کاوش سے کام لیا ہے اور اکثر کتب خانوں سے استفادہ کرکے کم و بیش تمام ماخذوں تک رسائی حاصل کرلی ہے اور اس طرح ادبی و علمی اور تاریخی و ثقافتی کتب اور جـــرائد سے مواد جمع کیا ہے اور قرینے سے ترتیب دیکر اسے بر عظیم کی ہزار سالہ تہذیبی و تمدنی زندگی کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی دراصل ایک واحد تصنیف ہے اور اردو کی ارتقائی تاریخ کے باب اور تمدنی شعور کے فروغ میں ایک غیر معمولی اضافہ ہے اور ادبی جلسوں اور شعری گلدستوں کی مدد سے «طبقات سخن» کی روایت کو ملحوظ رکھ کر مختلف شعرا کے رشتۂ تلمیذ اور سلسلۂ تلمذ کو یکجا کرنے کی عہد آفریں کوشش کی ہے۔ بالفاظ دیگر تاریخ ادب کی مدد سے ایک طویل دور کی ادبی سرگرمیوں

اور شعری کاوشوں کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے "شایانِ بریلوی کی تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ" یہ تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ ہے۔ اگر دونوں کا امتزاج کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس تذکرے میں اردو کے شعرا کے ساتھ فارسی اور عربی کے شعرا بارے میں بھی مبسوط مواد ملتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں بقول ڈاکٹر فرحی: "صاحبِ موصوف نے برسوں کی محنتِ شاقہ، شب و روز کی دیدہ ریزی اور ذاتی دید و دریافت سے متقاضائے اردو کو ایک انسائیکلوپیڈیا (قاموس) کی شکل دی ہے"۔ امید کی جاتی ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور ہر تعلیمی ادارہ اور ہر لائبریری کے جمع شدہ سرمایہ میں کتاب ھذا کو ایک بہترین اضافہ تصور کیا جائیگا۔

سید عظیم القدر صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے محترم جسٹس سید عنایت علی پیرزادے کے توسط سے یہ قیمتی تحفہ مجھے ارسال کیا ہے۔ یہ دستاویز چار جلدوں میں چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس پر کم و بیش تین ہزار سے زائد نامور اور گمنام شعرا اور ادبا کو مستند حوالوں سے محفوظ کرلیا ہے۔
اس قیمتی ادبی سرمایہ کو انجمن اسلام اردو انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں جمع کیا ہے تاکہ شائقینِ ادب اس بیش بہا کتاب سے استفادہ کرسکیں۔

درحقیقت یہ کارنامہ اردو ادب کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے جسکے لئے ناشرین بالخصوص اور سید عظیم القدر بریلوی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

فرحان پبلیکیشنز
بی ۱۹۸ بلاک جے
نارتھ ناظم آباد
کراچی (پاکستان)

• • •

حیدر آباد میں اُردو کی ترقی
تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے

مصنفہ : سید مصطفیٰ کمال

تبصرہ از

ڈاکٹر لئیق صلاح

مصطفیٰ کمال نے اس کتاب میں مختلف تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ آصف جاہی حکمران ، علاقائی یا صوبائی زبانوں کو برقرار رکھتے ہوئے غیر ملکی زبان کی ہم آہنگی سے کس طرح درس و تدریس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے .

پچھلے تجربات سے موجودہ نسل استفادہ کرسکتی ہے کیونکہ گذشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کی پانچ دہائیوں میں جس زبان نے ذریعہ تعلیم اور دفتری زبان کی حیثیت سے ایک اہم رول ادا کیا ہے ، اسی طریقۂ کار کو مشعل راہ بنایا جاسکتا ہے . فاضل مصنف کی مساعی اردو زبان سے وابستہ تمام افراد کے لئے اہمیت کی حامل ہیں . خواہ وہ درس و تدریس سے وابستہ ہوں یا مختلف انجمنوں اور تحریکوں سے .

مصنف نے زیر نظر تصنیف میں فارسی کا رول انتظامیہ میں کس حد تک تھا اور کتنی مدت تک رہا اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور اسے سلطنت غزنی کی پاسداری سے تعبیر کیا ہے آگے رقمطراز ہیں کہ مسلم فرماں رواؤں کے دور میں ، غیر مسلم اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور حاکمانِ وقت کی زبان سے واقفیت بھی حاصل کی . اس امر کا بھی انکشاف کیا ہے کہ قطب شاہوں نے ، فرامین اور احکامات اجرائی میں فارسی زبان کے ساتھ تیلگو کا بھی چلن روا رکھا تھا . زبان « ہندوی » سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد « اردو » نہیں بلکہ جو زبانیں دکن میں مروج تھیں وہی مقصود ہیں . اس باب میں بعض اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے . ایک تو یہ کہ « دکنی » کسی سرپرستی کے بغیر پھلتی پھولتی رہی . اور اس میں دفتری زبان بننے کی پوری پوری صلاحیت

موجود تھی لیکن اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔

دوسرا یہ کہ دکنی زبان کا فروغ، قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنت میں مختلف انداز میں ہوتا رہا اس میں شک نہیں کہ شعر و ادب کی سرپرستی دونوں نے کی لیکن ریاست گولکنڈہ (قطب شاہی) میں دکنی کے ساتھ تیلگو زبان مستعمل رہی جب کہ بیجاپور میں فارسی کے بعد دکنی کو اہمیت دی گئی فاضل مقالہ نگار نے فرشتہ پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے قطب شاہی دفتروں کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ لفظ "ہندوی" قطب شاہوں کے یہاں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "اعتماد راؤ برہمن کی سابقہ منصب دبیری فرامین ہندوی سرفراز بودهم"۔

مصنف کا یہ بیان قطعی درست ہے کہ دیگر محققین نے دکنی زبان اور تیلگو ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالی مگر انتظامیہ میں اس کے چلن کے تعلق سے اظہار خیال نہیں کیا سوائے ہارون خان شیروانی کے جنہوں نے "حدیقة السلاطین" کے حوالے سے عہدوں اور فرامین کے بارے میں اجمالی ذکر کیا ہے۔ موصوف نے ذو لسانی پالیسی کے سلسلے میں ساری تفصیلات پیش کی ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ ریاست کی اکثریت کی بول چال کی زبان تیلگو تھی۔ اس لئے نچلی سطح کی کاروائیوں کے کاغذات، احکامات و فرامین تیلگو میں ہوا کرتے تھے اور ضرورتاً مرہٹی میں ترجمہ کیا جاتا تھا ذو لسانی فرامین (فارسی اور تیلگو) کے علاوہ بعض فرامین صرف تیلگو میں بھی پائے جاتے ہیں جن کی پشت پر متصدی کی تحریر فارسی میں ہوتی تھی ایسے ہی فرامین کی نشاندھی کی گئی ہے جو علاقہ تلنگانہ سے متعلق ہیں لیکن فرمان مرہٹی میں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جن کے نام اجرائی عمل میں آتی ہے۔ ان کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

ان سلطنتوں میں فارسی کا تسلط برقرار رہا اور ساتھ ہی دکنی شعر و ادب کی سرپرستی ہوتی رہی۔ لیکن انتظامیہ میں اس کا عمل دخل نہ تو بہمنی حکمرانوں کے عہد میں رہا اور نہ اسکی جانشین سلطنتوں میں۔ عوام کی سہولتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نچلی سطح پر تمام کاروائیاں مقامی زبانوں (مرہٹی اور تیلگو) میں ہوا

کرتی تھیں اور دربار تک پہنچتے ہوئے، ترجمے کے ذریعے ان کا فارسی میں منتقل ہونا ضروری تھا شاہی مہر صرف فارسی احکامات پر ہی چسپاں کی جاتی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں بھی دفتری کاروائیوں کا یہی انداز رہا۔

مصطفی کمال نے لکھا ہے کہ آصفی فرمان رواؤں کے دور میں دفتر و کاروبار میں فارسی کی اہمیت برقرار رہی۔ لیکن ۱۹ویں صدی کے ابتدائی دہوں میں سرکاری امور کی نچلی سطح پر اردو کے لئے ماحول سازگار بنتا گیا۔ فارسی کی مقبولیت کے باوجود عوام کی پسندیدہ زبان اردو یعنی دکنی تھی۔ اس علاقے کی اکثریت کی مادری زبان تیلگو، مرہٹی اور کنڑی تھی۔ لیکن مسلمان اور ہندو کے ساتھ خواص و عوام کی مقبول عام زبان اردو ہی رہی ہے۔ اس طرح زبانوں کی اس کثرت کے درمیان اردو زبان کی وحدت کا نقش ابھرتا گیا۔

علاوہ ازیں دفتر مال و مُلکی کی اصطلاحات کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ انتظامی امور میں اردو کا چلن ہوا آسان فارسی کا استعمال ضروری سمجھا گیا۔ اس طرح فارسی کی مشکل پسندی اور ثقالت سے نجات ملی۔ اور مقامی زبانوں اور اردو کے لئے یہ تبدیلی فال نیک ثابت ہوئی، ان کا اثر بڑھ گیا، متصدی، منشی، تحصیل دار اور تعلقدار مقامی زبانوں سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے اور ساتھ ہی فارسی زبان پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ کام کی تقسیم اس طرح کی جاتی تھی، بنیادی ریکارڈ علاقائی زبان میں، تلخیص، ترجمہ اور تجاویز کے ذریعے اسے اعلیٰ سطح پر یک لسانی حیثیت دی گئی عوام سے ربط چہار زبانوں میں رکھا جاتا تھا۔ اس طرح سرکاری زبان کے وقار کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔

ذریعہ تعلیم اور مادری زبان کی اہمیت کے تعلق سے معلومات بہم پہونچاتے ہوئے موصوف نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب اردو زبان کا موئید تھا اور ساتھ ہی اردو مضمون نگاری اور تدریس کا حوایاں تھا

اردو کی فروغ و اشاعت کے سلسلے میں کلکتہ کالج، دلی کالج، سر سید کا

دار العلوم، مدرسہ شجاعیہ، مدرسہ فخریہ اور شمس الامراء کے دار الترجمہ کی خدمات کو ناقابل فراموش قرار دیا ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ یہ ساری کوششیں انگریزی کی مخالفت کے بغیر کی گئی تھیں۔

اردو ذریعۂ تعلیم کی نشاندھی کرتے ہوئے، میڈیکل کالج اور دار العلوم کے ابتدائی دور کا ذکر کیا گیا ہے جہاں تفہیم و تشریح کے لئے اردو کا استعمال ہونے لگا تھا، اور ساتھ ہی محکمۂ تعلیم کی بے اعتنائی کا تذکرہ بھی ہے اور اس طرح رفعت یار جنگ کو محرکِ جامعہ قرار دیا ہے۔

موصوف نے موضوع کے اعتبار سے صرف ذریعۂ تعلیم اور انتظامیہ کی حد تک معلومات فراہم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دیگر امور جو اثنائے تحقیق دستیاب ہوئے ہیں ان پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے۔ زیرِ نظر کتاب "حیدر آباد میں اردو کی ترقی بہ حیثیت تعلیمی اور سرکاری زبان کے" میں انتظامیہ کے پہلے درس و تدریس کا ذکر بعد میں ہونا چاہئے تھا اور دوسرا یہ کہ اس دور کے عہدوں یا خاص اصطلاحوں کے تعلق سے حاشئے میں صراحت کرنا ضروری تھا کیونکہ آج کی نسل ان سے واقف نہیں اور نہ وہ الفاظ اب مستعمل ہیں۔ ۱۸۵۷ع کے بارے میں صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ جنوب والے اس تحریک سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ اس دور کی بعض تاریخوں میں اس امر کی نشاندھی کی گئی ہے کہ سید احمد شہید اور اسماعیل شہید نے اپنے نمائندوں کو جنوب روانہ کیا تھا اور شاہزادہ مبارز الدولہ کے علاوہ دیگر افراد اس سے متاثر ہوئے اگرچہ یہ بالکل درست ہے کہ سالار جنگ نے بالخصوص اس شورش کو دبانے کی پوری پوری کوشش کی اور کامیاب رہے۔

اس کتاب کو شگوفہ پبلیکیشنز، حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔

●

تلاش آزاد مصنفہ عبدالقوی دسنوی

تبصرہ از

ڈاکٹر حامداللہ ندوی

"تلاش آزاد" مولانا ابوالکلام آزاد پر، عبدالقوی دسنوی کے ۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف وقتوں میں لکھے تھے اور ۹۰-۱۹۸۸ع کے جشن صد سالہ کے موقع پر، مہاراشٹرا اردو اکادمی کی مالی اعانت سے، کتابی صورت میں شائع کئے۔ ان مضامین کے عنوان ہیں: ۱- مولانا ابوالکلام آزاد، مختصر حالات زندگی، ۲- مولانا آزاد، وادی صحافت میں، ۱۹۰۸ع تک، ۳- نو عمر صحافی، ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی، ۴- مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار پیغام، ۵- مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی سفر، پہلی گرفتاری تک، ۶- مولانا ابوالکلام آزاد کی نظربندی، ۷- مولانا آزاد پہلی بار قید فرنگ میں، ۸- مولانا ابوالکلام آزاد وادی شاعری میں، ۹- زلیخا بیگم کی کہانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسروں کی زبانی۔ ابتدا میں خود فاضل مصنف کا لکھا ہوا ایک پیش لفظ ہے۔ جس میں انہوں نے مولانا آزاد کی علمی، ادبی اور صحافتی زندگی کا نچوڑ بڑے فکرانگیز انداز میں پیش کیا ہے۔

مضامین کے عنوانات سے خود ہی ظاہر ہے کہ اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے کن گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر مضامین کی ترتیب میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ اگر انہیں اسی ترتیب سے پڑھا جائے تو مولانا آزاد کی زندگی اور ان کے علمی، ادبی اور سیاسی کارنامے ایک ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آجائیں اور ہمیں مولانا آزاد کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے میں ان سے پوری پوری مدد ملے۔ علاوہ ازیں ان میں سے ہر مضمون اُس موضوع پر موجود سارے مواد کا نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ اس خوبی سے احاطہ کرتا ہے کہ ہمیں کہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

مولانا آزاد کی شخصیت علمی، ادبی اور سیاسی اعتبار سے مختلف فیہ تھی۔ ایک گروہ نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا، دوسرے نے ان میں صرف خامیاں تلاش کیں۔ فاضل مصنف نے اِن اختلافات کی گتھیاں سلجھانے میں اپنا زور قلم ضائع نہیں

کیا ہے بلکہ واقعات اور حقائق کی مدد سے آزاد کی صرف ایک صاف ستھری تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے، جو سچی بھی ہے اور دلکش بھی، اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی اس کتاب میں آزاد کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو بھی زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا ہے جو کل تک پوری طرح واضح نہ تھے، چنانچہ اس کتاب کے آخری دو مضمون۔ مولانا ابوالکلام آزاد وادی شاعری میں اور زلیخا بیگم کی کہانی مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسروں کی زبانی، آزاد کے کچھ ایسے ہی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔

حقیقت بیانی اور مختصر نویسی وہ دو خوبیاں ہیں جو فاضل مصنف کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہیں، وہ صاف ستھری اور آسان زبان لکھتے ہیں، الفاظ کا استعمال صرف اتنا ہی کرتے ہیں جتنا اپنی بات کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے، مبالغہ یا جانبداری سے کبھی کام نہیں لیتے، نہ غیر ضروری اختلافات میں الجھتے ہیں، ان تحریر کی یہ خصوصیات اس کتاب میں بھی نمایاں ہیں

مولانا آزاد کی زندگی میں، اور ان کی موت کے فوراً بعد ان پر بہت کم لکھا گیا کیونکہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر بے اعتمادی اور ناسپاسی کا ایک غبار سا چھایا ہوا تھا، مگر جوں ہی یہ غبار چھٹا، ایک ساتھ بہت سے قلم حرکت میں آئے اور پھر ہندوستان کی علمی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش شروع ہوگئیں جو آج بھی جاری ہیں، خود فاضل مصنف کی آزاد پر ۱۹۶۷ع سے لے کر اب تک دس گیارہ چھوٹی بڑی کتابیں مختلف اداروں سے شائع ہو چکی ہیں ان کی یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

بلا شبہ "تلاش آزاد" اردو میں اپنے موضوع کی بڑی اچھی کتاب ہے، جو لوگ آزاد کی شخصیت کو کم سے کم وقت میں صحیح طور پر سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں اور زیادہ تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے ان کے لئے یہ آزاد پر ایک بہترین علمی تحفہ ہے۔

ضخامت ۱۴۰ صفحات، قیمت چالیس روپئے،

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔ ۲۵۔

مقالات

اسلامیات

احمد کنعان (سعودی عرب)

قصر حمراء۔ایک اسلامی یادگار

(البلاغ بمبئی، جولائی ۱۹۹۲ع، جلد ۲، شمارہ ۱۲، ص ۶۳۔۶۶)

مضمون نگار نے اپنے سفر اسپین کے مشاہدات کے پس منظر میں وہاں کی مشہور یادگار قصر حمراء کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

اصلاحی ضیاء الدین

سوئے حرم

(معارف اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۹۲ء، جلد ۱۵۰، شمارہ ۱، ص ۶۳۔۷۲)

اصلاحی صاحب رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر حج کے لئے گئے تھے اور اس مضمون میں انہوں نے اپنے سفر حج کے تجربات اور مشاہدات پر اظہار خیال کیا ہے۔

اورخان محمد علی

اوفا۔ایک برطانوی مسلم بادشاہ

(البلاغ بمبئی، جولائی ۱۹۹۲ع، جلد ۲، شمارہ ۱۲، ص ۵۳۔۵۵)

اوفا ایک بادشاہ ہے جس نے ۷۵۷ تا ۷۹۶ انگلستان پر حکمرانی کی۔ اس کے عہد کے دو سکے دریافت ہوئے ہیں جن کے دونوں جانب عربی زبان میں کلمۂ توحید قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ اس بادشاہ کے متعلق ایک خیال یہ ہے

کہ وہ مسلمان تھا۔

جمیل احمـــــد

مسلمانوں کی قتل گاہ، یورپ کی
نئی ریاست بوسنیا

(البلاغ بمبئی، اگست ۱۹۹۲ ع، جلد ۳، شمارہ ۱، ص ۱۶ - ۲۰۔

یورپ کی مسلم ریاست بوسنیا پر اس کے دو عیسائی پڑوسی ملک، سربیا اور کروشیا بری طرح حملے کر رہے ہیں اور اس کے وجود کو ختم کر دینا چاہتے ہیں ان حالات میں امت مسلمہ کی ذمہ داری کیا ہونی چاہئے اسکی وضاحت کی ہے۔

زمخشری

احتشام الحسن کاندھلوی (مترجم)

حضرت علی کے مناقب حضرت ابوبکر
کی زبانـــی

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲، ص ۶۲۰ - ۶۵۴)

احادیث اور واقعات کی مدد سے بتایا ہے کہ رسول اللہ اور حضـــرت ابوبکر دونوں حضرت علی کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر اور حضـرت علی میں کوئی آویزش نہ تھی۔

سمیع اللہ بیگ

ہند، عہد اورنگ زیب میں

(خدا بخش لائبریری جنرل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲، ص ۷۲۵-۸۶۲)

جے۔ آر۔ رائے نے زمانہ مارچ-اپریل ۱۹۲۳ ع میں اپنا ایک مضمون "ہندوستان عہد مغلیہ میں" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں عہد مغلیہ کی برائیاں بیان کی گئی تھیں۔ یہ کتاب اس کا جواب ہے جو ۱۹۲۴ ع میں شائع ہوئی تھی۔

عبدالرؤف خان

اورنگ زیب اور بعض ہندو راجاؤں کا
تقـابلی مطـالعہ

(معارف اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۹۲ ع، جلد ۱۵۱، شمارہ ۱، ص ۵ - ۳۳)

بعض ہندو راجاؤں اور کمانڈروں کے مسلمانوں پر ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان اور اورنگ زیب کے ان فرمـانوں کی تفصیلات جن سے معلـــوم ہوتا ہے کہ

اورنگ زیب نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے بیسیوں مندروں اور ان کے پجاریوں اور پنڈتوں کو کتنے وظائف اور جاگیریں عطا کیں.

فاروق اعظمی

ہندوستان کے مسلم سلاطین کے
سیرت و کردار کی چند جھلکیاں

(البلاغ بمبئی، جولائی ۱۹۹۲ ع، جلد ۳، شمارہ ۱۲، ص ۲۹-۳۴)

اس مضمون میں ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن اور محمد تغلق کے سیرت و کردار کا جائزہ لیا ہے۔

فواد سیزگین
خورشید رضوی (مترجم)

مسلمان اور سائنس

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲
ص ۵۲۷-۶۲۰)

فواد سیزگین کے حسب ذیل چار خطبات کا ترجمہ:

۱- تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام،
۲- فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام،
۳- عربیوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر
۴- آثار علویہ کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

محمد انصار اللہ

ابتدائی دور کے ہندوستانی مسلمان
اور قرآن پاک کے تراجم

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲، ص ۶۰۵-۶۱۱)

تیسری صدی ہجری سے موجودہ دور کے تراجم قرآن پاک کا ذکر، ابتدائی دور میں آیات کا اور بعد میں پورے قرآن پاک کا. بعض ہندؤں نے بھی قرآن پاک کے ترجمے کئے ہیں۔

محمد عارف اعظمی عمری

بلغاریہ- آئینۂ ایام میں

(معارف اعظم گڈھ، جون ۱۹۹۲ ع، جلد ۱۵۰، شمارہ ۶، ص ۴۵۲-۴۶۶)

سلطنت عثمانیہ کا قیام بلغاریہ پر اس کے قبضہ کی تاریخ، اور بلغاریہ کی موجودہ مسلم آبادی کی تفصیلات.

مرزا جان

حدیقه شهداء

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنه، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شماره ۵۷-۶۲، ص ۸۲۷-۸۶۴)

آج کس طرح سن ۱۲۷۲ھ میں بھی اجودھیا میں ایک مسجد دو مندر کا ایک جھگڑا ہوا تھا جس میں کافی مسلمان شہید ہوئے امیر الدین علی اس جہاد کے قائد تھے. مرزا جان بھی اس جہاد میں شریک تھے اور انہوں نے اپنا آنکھوں دیکھا حال حدیقه شهداء کے نام سے لکھا.

مهدی حسن

چینی زبان کے الفاظ قرآن میں

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنه، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شماره ۵۷-۶۲، ص ۶۱۳)

کرسی اور خزانه، ان دو لفظوں کو مضمون نگار نے چینی الاصل بتایا ہے. اور یه دو لفظ قرآن مجید میں بھی استعمال ہوئے ہیں.

ندوی بلال عبدالحی حسنی

رسول اکرم صلی الله علیه وسلم کے عہد میں مدینه کے یہود

(معارف اعظم گڈھ، جون ۱۹۹۲ ع، جلد ۱۵۰، شماره ٦، ص ۴۰۹-۴۲۴)

یه مضمون کی دوسری قسط ہے. اس میں مدینه کے یہودیوں کی تعلیمی، ثقافتی سیاسی، اور سماجی حالت پر روشنی ڈالی ہے.

ندوی مختار احمد

مختارات

(البلاغ بمبئی، اگست ۱۹۹۲ ع، جلد ۳، شماره ۱، ص ۳۵-۳۸)

طلاق اور حلاله کے مسئله پر بحث احادیث کی روشنی میں کی ہے اور بتایا ہے که حلاله ناجائز ہے اور زنا کے برابر ہے.

یوسف القرضاوی

موجوده اسلامی بیداری میں عورت کا کردار

(البلاغ بمبئی، جولائی ۱۹۹۲ ع، جلد ۲، شماره ۱۲، ص ۲۰۲-۱۰٦)

آج جو اسلامی بیداری کی لہر پوری

دنیا میں پہلی ہوتی ہے اس کا جائزہ، اور اس کی وضاحت کہ عورت کا اس بیداری میں کیا کردار ہونا چاہئیے۔

ادبیات

اختر حسین رائے پوری

صبا اکبر آبادی کی شاعری

(شاعر بمبئی، ۱۹۹۲ء، جلد ۶۳، شمارہ ۲، ص ۱۱-۱۲)

صبا اکبر آبادی کی شاعری کا تعارف اور ان کی کچھ غزلیں انہیں کے خط میں۔

اخلاق اثر

کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم ایک سرسری مطالعہ

(ہماری زبان دہلی، ۲۲ مئی ۱۹۹۲ء، جلد ۵۱، شمارہ ۲۰، ص ۲)

سید مظفر حسین برنی کی مرتب کردہ کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم کا تعارف اس کی پہلی جلد میں ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۸ء تک کے مکاتیب تھے اور اس جلد میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۸ء تک کے مکاتیب ہیں۔

اصلاحی ضیاء الدین

مولانا محمد علی جوہر، اردو کے ایک بلند پایہ ادیب

(البلاغ بمبئی، جولائی ۱۹۹۲ء، جلد ۲، شمارہ ۱۲، ص ۴۷-۵۱)

«ہمدرد» میں وقتاً فوقتاً محمد علی جوہر کے جو مضامین شائع ہوئے اس کا ایک مجموعہ ۱۹۳۸ء میں محمد سرور نے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ اسی کی روشنی میں محمد علی جوہر کو اردو کے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

خورشید زہرا عابدی

اردو کی پہلی تخلیق کار خاتون رشیدۃ النساء

(شیرازہ سری نگر، نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء شمارہ ۱۱، ۱۲، ص ۹۵-۹۹)

رشیدۃ النساء (۱۸۵۵ء-۱۹۲۹ء) کاشف الحقائق کے مصنف امداد اثر کی سوتیلی بہن تھیں اور پٹنہ کی رہنے والی تھیں۔ اور سر سید کی تحریک سے متاثر تھیں ان کے ناول اصلاح النساء کا ادبی، اور سماجی جائزہ ہے۔

خوشدیو میق

پونچھ میں اردو۔ ایک جائزہ

(شیرازہ سری نگر، فروری ۱۹۹۰ ع، جلد ۲۹، شمارہ ۲، ص ۴۱-۵۰)

پونچھ ریاست جموں و کشمیر کا ایک حصہ ہے اس کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے بعد بتایا ہے کہ ۱۸۹۲ ع میں پہلی بار راجہ بلدیو سنگھ نے پونچھ میں فارسی کی جگہ اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔ اور اسطرح وہاں اردو کی ترویج و اشاعت شروع ہوگی۔

دسنوی عبد القوی

ایک فکر انگیز اداریہ

(ہماری زبان دہلی، ۲۲ جولائی ۱۹۹۲ ع جلد ۴۱، شمارہ ۲۸، ص ۲)

تبصروں میں مبالغہ آمیز حد تک تعریفی و توصیفی کلمات استعمال کرنے والوں کے خلاف ہماری زبان بابت ۸ جون ۱۹۹۲ ع میں ایک اداریہ شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس کی تائید میں ہے۔

دسنوی شہاب الدین

اردو۔ حال اور مستقبل میں

(ہماری زبان دہلی، ۸ جون ۱۹۹۲ ع، جلد ۵۱، شمارہ ۲۳، ص ۱)

آزادی کے بعد ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دینے اور مصنوعی طور پر اس کو پروان چڑھانے کی کوششوں سے اردو والوں کے لئے جو دشواریاں پیدا ہوئی ہیں ان کا حل نکالنے کے لئے اردو کے ادیبوں اور دانشوروں سے «ہماری زبان» کے ذریعہ اظہار خیال کرنے کی دعوت۔

دلوی عبدالستار

قومی زبان اور ہندوستانی

(ہماری زبان۔دہلی، یکم جولائی ۱۹۹۲ ع جلد ۵۱، شمارہ ۲۵، ص ۱)

ہندوستان کی زبانوں کا ایک تاریخی جائزہ «ہندوستانی» کی نشو و نما کے ایک پس منظر کی حیثیت سے۔

داوی عبدالستار

سنیتی کمار چٹرجی اور اردو

(ہماری زبان دہلی، ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ ع جلد ۵۱ شمارہ ۲۷، ص ۸)

سن ۱۹۷۳ ع مہاتما گاندھی میموریل

ریسرچ سینٹر بمبئی کے زیر اہتمام سنیتی کمار چٹرجی نے "ہندوستان" کثیر اللسانی ملک اور اس کے اللسانی مسائل، ایک خطبہ دیا تھا، اس کی روشنی میں ان کی اردو دوستی پر بحث کی گئی ہے۔

راج بہادر گوڑ

آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل

(ہماری زبان دہلی، ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ ع جلد ۵۱، شمارہ ۲۷، ص ۱)

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے سالانہ کنونشن میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل پر ایک خطبہ دیا تھا، اسی کو اب شائع کیا گیا ہے۔

رئیس احمد نعمانی

ہندوستان کے فارسی شعراء، اقبال کے بعد

(شیرازہ سری نگر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ ع جلد ۲۸، شمارہ ۱۱، ۱۲، ص ۴۱-۵۸)

ہندوستان کے فارسی شعراء کا بہ طور پس منظر، سرسری جائزہ لینے کے بعد ان فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے جو اقبال کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں

سعید الظفر چغتائی

خطوط جوش ملیح آبادی بنام عبدالماجد دریابادی

(آجکل دہلی، جون ۱۹۹۲ ع، جلد ۵۰، شمارہ ۱۱، ص ۳-۱۱)

یہ مضمون کی دوسری اور آخری قسط ہے، اس کی پہلی قسط مارچ ۱۹۹۲ ع کے شمارہ میں شائع ہوئی جس میں جوش کے ۱۴ خط تھے جو انھوں نے قیام حیدر آباد کے زمانہ میں لکھے تھے، اس میں اٹھارہ خط ہیں، جو انہوں نے مختلف مقامات سے عبدالماجد دریابادی کو لکھے ہیں۔

سید علی حیدر نیر

ارمغان بہار

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲، ص ۳۹۰-۴۳۸)

ارمغان بہار، صوبہ بہار کے تیس شعراء کے اشعار کا انتخاب ہے جس کو قاضی عبدالودود نے مرتب کیا تھا یہ چھپ چکا ہے مگر نایاب ہے اس لئے دوبارہ چھاپا ہے۔ آخر میں قاضی صاحب کی

کچھ یاد داشتیں ہیں جو ان کے اپنے خط میں درج ہیں۔

سید محمد عقیل

اردو ادب کدھر

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۲، شمارہ ۵۷-۶۲، ص ۱۸۳-۲۰۴)

اردو شاعری، افسانہ تنقید، ناول کا جو ادبی ذخیرہ سن 1951 ع کے بعد سے اب تک وجود میں آیا ہے یہ اس کا محاسبہ ہے۔

شافع قدوائی

فراق کا تنقیدی نظام

(آجکل دہلی، جولائی ۱۹۹۲ع، جلد ۵۰ شمارہ ۱۲، ص ۲۲-۲۷)

فـــراق کے تنقیدی مضامین کا جائزہ اندازے، اردو کی عشقیہ شاعری اور اردو غزل گوئی، کی روشنی میں۔

صابر سنبھلی

زبان دانی کیا ہے

(ہماری زبان دہلی، ۲۲ جولائی ۱۹۹۲ع جلد ۵۱، شمارہ ۲۸، ص ۱)

علم زبان اور علم لسانیات کا فرق بیان کرنے کے بعـــد زبان دانی کے اصول و ضوابط سے بحث کی ہے۔

صدیقی سعادت علی

روزگار- اردو کا بنیادی مسئلہ

(ہماری زبان دہلی، ۸ جولائی ۱۹۹۲ع جلد ۵۱، شمارہ ۲۶، ص ۱-۲)

ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام میں اردو روزگار کا وسیلہ نہیں بن سکی، اس کو روزگار کا وسیلہ بنانا صرف حکومت کی نہیں ہماری بھی ذمہ داری ہے۔

صدیقی فصیح احمد

اردو یک بابی ڈراموں میں موضوعاتی و فکریاتی تنوع

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۲ع، جلد ۴۲) شمارہ ۱، ص ۴۹-۶۹)

مضمون کی دوسری قسط، اس میں ۱۹۴۵ع سے ۱۹۷۵ع تک کے یک بابی ڈراموں کے موضوعاتی و فکریاتی تنوع سے تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں ان ۱۴۲ ڈراموں کی فہرست ہے۔

عباد اللہ گیانی

گرو گرنتھ صاحب اور اردو

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ع، شمارہ ۶۲-۵۷، ص ۶۷۵-۷۳۴)

گرو گرنتھ صاحب کا تعارف اور اس میں استعمال شدہ اردو الفاظ کا جائزہ.

عزیز اللہ شیرانی

راجستھان میں اردو کی اعلا تعلیم
اور روزگار کے مسائل

راجستھان میں اردو کی اعلا تعلیم اور روزگار کا آزادی سے پہلے کیا حال تھا اور آزادی کے بعد کیا حال ہوا اس کا تذکرہ.

کوثر چاند پوری

قائم چاند پوری

(آجکل دہلی، جون ۱۹۹۲ع، جلد ۵۰ شمارہ ۱۱، ص ۱۲-۱۹)

قائم چاند پوری کے حالات زندگی پر ان کے صاحبزادے کوثر چاند پوری کی لکھی ہوئی ایک غیر مطبوعہ کتاب کے چند اقتباسات.

محمد بدیع الزماں

اقبال کا مرد مومن

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۲ع، جلد ۴۳، شمارہ ۱، ص ۱-۲۴)

مضمون کی دوسری قسط، اس میں قرآن مجید کی روشنی میں اقبال کے فلسفہ تقدیر کو واضح کیا گیا ہے.

عمار شمیم

مدھیہ پردیش کے دانش کدوں اور درس گاہوں میں اردو تحقیق-ایک جائزہ

(ہماری زبان دہلی، یکم جون ۱۹۹۲ع شمارہ ۲۱، ص ۲)

اردو کی ان تحقیقی خدمات کا تذکرہ جو حمیدیہ کالج بھوپال، سیفیہ کالج بھوپال رابرٹسن کالج جبلپور کے اساتذہ اور طلبہ نے انجام دیے.

نور السعید اختر

دکنی ادب میں ثقافتی عنصر کی چھان بین

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۲، جلد ۴۳ شمارہ ۱، ص ۲۵-۴۸)

دکنی کا تاریخی پس منظر مختصراً بیان

کرنے کے بعد ان کہانیوں کی تفصیلات تا جون ۱۹۹۱ع شمارہ ۵۷-۶۲ ۔
پیش کی گئی ہیں جن کا ذکر دکنی ادب ص ۳۷۱)
میں ملتا ہے۔

شخصیات

مظہر امام

حامدی کاشمیری

(شیرازہ سری نگر، نومبر دسمبر ۱۹۸۹ع
جلد ۲۸، شمارہ ۱۱، ۱۲، ص ۱۶-۱۶)

حامدی کاشمیری کی شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کا ایک تفصیلی جائزہ

صفدر امام قادری

ظ۔ انصاری مرحوم

(ہماری زبان دہلی، یکم جون ۱۹۹۲ع
جلد ۵۱، شمارہ ۲۱ ص ۱)

ظ انصاری کے حالات زندگی ان اور علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا سرسری جائزہ۔

ظل الرحمٰن خان

ذاکر صاحب

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری

ذاکر صاحب کے حالات زندگی اور ان کے سیاسی، تعلیمی اور مذہبی افکار کا جائزہ

ضیاء حسن

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب

(البلاغ بمبئی، جون ۱۹۹۲ع، جلد ۲، شمارہ ۱۱، ص ۴۴-۴۸)

یہ مضمون کی پہلی قسط ہے اور اس میں مولانا الیاس کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے جو ایک مخلص دردمند اور امت اسلامیہ کے لئے بے قرار انسان کی مثالی تصویر پیش کرتے ہیں۔

یوسف متالہ

گجرات کے بعض سلاطین، امرا و مشائخ

(معارف اعظم گڈھ، جون ۱۹۹۲ع، جلد ۱۵۰، شمارہ ٦، ص ۴۲۵-۴۴۰)

سلطان محمود بیگڈہ، سلطان مظفر حلیم بن محمود بیگڑہ کے حالات زندگی اور ان کی دینداری کی تفصیلات۔

اکبر حیدری کاشمیری

اکبر الہ آبادی - بعض نئے گوشے

(شیرازہ سری نگر، جنوری ۱۹۹۰،
جلد ۲۹، شمارہ ۱، ص ۵-۳۵)

اردو کے متعدد پرانے پرچوں میں شائع شدہ مضامین کی مدد سے اکبر الہ آبادی کی زندگی کے کچھ ایسے گوشوں کو روشنی میں لایا گیا ہے جو اب تک لوگوں کی نظر سے اوجھل تھے۔

انور سدید

ڈاکٹر سید عبداللہ، یادیں اور باتیں

(ہماری زبان دہلی، ۸ مئی ۱۹۹۲ ع،
جلد ۵۱، شمارہ ۱۸، ص ۱-۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ، ذاتی مشاہدات کی روشنی میں کیا ہے۔

متفرقات

احمد آتش
اکمل ایوبی (مترجم)

ترکی کا ایک غیر معروف کتب خانہ

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری
تا جون ۱۹۹۱ع، شمارہ ۵۷-۶۲،
ص ۸۸۰-۸۹۶)

اناطولیہ کے ایک شہر قسطمونی میں موجود ایک کتب خانہ کا تعارف اور اس کی بعض منتخب کتابوں کا ذکر۔

سید نعیم الدین

بروصہ کے کتب خانوں کے
چند فارسی مخطوطات

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری
تا جون ۱۹۹۱ع، شمارہ ۵۷-۶۶،
ص ۹۱۷-۹۲۰)

ترکی کے پانچویں بڑے شہر بروصہ کے چھ کتب خانوں کا تعارف اور ان میں موجود بعض فارسی مخطوطات کا تذکرہ۔

شفقت رضوی

مبادی علم جیولوجی
(حالی کی ترجمہ کی ہوئی
ایک نایاب کتاب)

(سب رس حیدر آباد، جولائی ۱۹۹۲ع
جلد ۵۵، شمارہ ۷، ص ۵-۷)

حالی کی مذکورہ بالا ایک نایاب کتاب کا تعارف اس کے پس منظر کے ساتھ۔

شیخ نذیر حسین

شیخ موفق الدین عبداللطیف بغدادی
اور مصر کے عجائبات

(معارف اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۹۲ ع
جلد ۱۵۱، شمارہ ۱، ص ۵۲-۶۲)

موفق الدین چھٹی صدی ہجری کے بغداد کے ایک عالم اور طبیب تھے، انہیں مصر دیکھنے کا بہت شوق تھا، سلطان صلاح الدین ایوبی کے وظیفہ پر وہ وہاں گئے اور جامعہ ازہر میں قیام کیا۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں مصر پر مختلف زاویوں سے بحث کی ہے۔ انہیں کے حالات زندگی اور ان کی کتابوں کی اس مقالہ میں تفصیل ہے۔

عظیم شیخ

حیاتین کی دریافت

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، مارچ ۱۹۹۲ ع
جلد ۱۱، شمارہ ۳، ص ۱۵-۲۲)

حیاتین Vitamin کی دریافت دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوئی تھی، اس میں حیاتین کے اقسام ان کے فوائد اور ان کے دریافت کرنے والوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

قیصر سرمست

داستان ماہ

(شیرازہ سری نگر، جنوری ۱۹۹۰ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱، ص ۴۹-۵۸)

انگریزی مہینوں کے ناموں کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے

محمد اسلم پرویز

دیو پیکر درندے

(تہذیب الاخلاق علی گڈھ، مارچ ۱۹۹۲ع
جلد ۱۱، شمارہ ۳، ص ۲۷-۳۱)

زمانۂ قدیم کے چند دیو پیکر درندوں کی تفصیلات جو اب ناپید ہیں

محمد غوث

استنبول کے کتب خانے

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ع، شمارہ ۵۷-۶۲، ص ۸۹۷-۹۱۶)

استنبول کے اٹھارہ کتب خانوں کا تذکرہ۔

محمد فاروق اعظمی

بابل و نینوا سے روس اور امریکہ تک

(البلاغ بمبئی، حج نمبر، مئی ۱۹۹۲ ع
جلد ۲، شمارہ ۱۰، ص ۴۹-۵۱)

مضمون کی پہلی قسط۔اس میں بابل و نینوا کی تاریخ درج ہے۔

محمد فاروق اعظمی

بابل و نینوا سے روس اور امریکہ تک

(البلاغ بمبئی، جون ۱۹۹۲ ع، جلد ۲
شمارہ ۱۱، ص ۱۶-۱۸)

بابل و نینوا اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود تباہی و بربادی سے بچ نہ سکے اب روس اور امریکہ نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ (آخری قسط)

اصلاحی ضیاء الدین

قدیم اور عہد وسطی کے ہندوستان میں
نقش و نگاری و برتن سازی

(آجکل دہلی، جون ۱۹۹۲ ع، جلد ۵۰
شمارہ ۱۱، ص ۲۰-۲۴)

ہندوستان میں نقش نگاری و برتن سازی کی عہد بعہد تاریخ، حجری عہد سے لے مغلیہ عہد تک۔

افتخار احمد مدنی

خدا بخش فہرست مخطوطات فارسی
مراۃ العلوم کے تسامحات

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری
تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲
ص ۹۲۱-۹۵۶)

مراۃ العلوم کے نام سے خدا بخش لائبریری کے فارسی مخطوطات کی تین مختصر فہرستیں شائع ہوئی ہیں۔ مقالہ نگار نے ان کے تسامحات کی نشاندھی کی ہے۔

انوار الحسن

تواریخ نادر العصر

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری
تا جون ۱۹۹۱ ع، شمارہ ۵۷-۶۲،
ص ۱-۱۷۴)

« مختصر کیفیات ہند و تواریخ اودھ تا عہد واجد علی شاہ مسمٰی بہ تواریخ نادر العصر »، منشی نولکشور نے کرنیل ایبٹ کمشنر لکھنو کو بطور تحفہ پیش کرنے کے لئے سن ۱۸۶۳ ع میں شائع کی تھی، یہ اس کا متن ہے ابتدا میں انوار الحسن کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ ہے۔ جس میں منشی نولکشور کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید حامد

تعلیمی کارواں

(ہماری زبان دہلی، یکم جون ۱۹۹۲ع
جلد ۵۱، شمارہ ۲۱، ص ۸)

یو۔ پی کے مسلمانوں میں تعلیمی شعور کو عام کرنے کی غرض سے اساتذہ علماء اور طلبہ کا جو کارواں ۱۰ اپریل کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے چلا تھا اس کی روئیداد ہے۔

سید حامد

تعلیمی کارواں

(ہماری زبان دہلی، ۸ جون ۱۹۹۲ع،
جلد ۵۱، شمارہ ۲۲، ص ۸)

یہ مضمون کی دوسری قسط ہے۔ اور اس میں ان علاقوں کا ذکر ہے جہاں سے یہ کارواں اپنا پیغام عام کرتا ہوا گذرا تھا۔

سید حسن عسکری

سفرنامۂ قسطنطنیہ، عراق و ایران

(خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری تا جون ۱۹۹۱ع، شمارہ ۵۷-۶۲،
ص ۴۴۳-۵۲۶)

سید حسن عسکری کے مذکورہ سفرنامہ کا متن، جو انہوں نے ۱۹۲۲ع کے آس پاس لکھا تھا۔ یہ سفرنامہ تعلیمی پریس لکھنو نے شائع کیا تھا۔

•

Edited by Prof. Nizamuddin S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director, Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Published by Mr. Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary, Anjuman - i - Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400008

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

- لغات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)
- انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)
- مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)

جناب عبدالرزاق قریشی

- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- واگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ محترمہ رفیہ انعامدار

نوائے ادب بمبئی

FORM : IV - ROLL NO : VIII

Registration No. 32009/50 رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)

نوعیت اشاعت : ششماہی

نام پرنٹر : جناب عبدالمجید پالکا، بی کام (آنرز)

قومیت : ہندوستانی

پتہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)

نام پبلشر
قومیت
پتہ
ایضاً

نام ایڈیٹر : پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

قومیت : ہندوستانی

پتہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)

نام پتہ مالک رسالہ : ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof. N. S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Bombay-400 001

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rupees Thirty • Foreign . Pound Seven

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ء میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ پوسٹ گریجویٹ تعلیم و تحقیق کا انتظام کرنا
۲ تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد کرنا
۹ اردو و دیگر متعلقہ زبانوں کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

● ● ●

نوائے ادب، بمبئی

(۱۹۵۰ء)

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

(سال میں دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

۱ اردو و متعلقہ زبانوں و ادبیات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو و دیگر متعلقہ زبانوں سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر نقد و تبصرے

(سالانہ چندہ ۳۰ روپیے)

●

نوائے ادب کے مدیران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۵۰ سے ۱۹۵۵)
ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (۱۹۵۶ سے ۱۹۶۷)
جناب عبدالرزاق قریشی (۱۹۶۸ سے ۱۹۷۵)
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۶ سے جاری)

REGISTRATION NO. : 12009/50

NAWA-E-ADAB

(Biannual)

VOLUME : XXXXII
OCTOBER
1992

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001